نقش برآب

(شخصی خاکوں کا مجموعہ)

سہیل انجم

نقش برآب

(شخصی خاکوں کا مجموعہ)

سہیل انجم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

NAQSH BAR AAB

by

Suhail Anjum

Year of Edition 2016
ISBN 978-93-5073-764-4

₹ 250/-

نام کتاب	:	نقش بر آب (شخصی خاکوں کا مجموعہ)
مصنف	:	سہیل انجم
پتہ	:	سہیل انجم، 370/6 A ذاکر نگر، نئی دہلی 110025
سال اشاعت	:	۲۰۱۶ء
قیمت	:	۲۵۰ روپے
مطبع	:	عفیف پرنٹرس دہلی۔٦

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، 87 بلاک۔ 7 میونسپل کوارٹرس، کانچ کی مسجد کے پاس، جمال پور، احمد آباد۔ 380022
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسیس بلڈنگ، ای۔ آر۔ روڈ، ممبئی۔ 400003 فون نمبر: 022-23774857
☆ ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، 22-7-454/455، مسجد ایک خانہ کے سامنے، پرانی حویلی، حیدر آباد۔ 2
☆ حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد (فون نمبر: 040-66806285)
☆ انجمن ترقی اُردو، اردو ہال، حمایت نگر، حیدر آباد ☆ رائی بک ڈپو، 734، پرانا کٹرہ، الٰہ آباد (یوپی)
☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔4 ☆ عثمانیہ بک ڈپو، 125 رابندرا سرانی، کلکتہ۔ 700073
☆ دانش محل، امین الدین پارک، لکھنؤ۔ 226018 (یوپی)

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

فہرست

☆☆

دو باتیں

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں خاکہ نگاری کے فن سے نابلد ہوں۔ اس کی باریکیوں سے ناواقف ہوں۔ اس کے اجزائے ترکیبی سے بے بہرہ ہوں۔ اس لیے میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ خاکے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ مضامین میں خاکوں کی جھلک ہو۔ اس کا فیصلہ اہل فن اور اہل نظر کریں گے کہ ان مضامین کو کیا کہا جائے۔ خاکے، سوانحی مضامین یا تاثراتی تحریر۔ بہر حال جو بھی ہے قارئین کے سامنے حاضر ہے۔

میں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس قسم کے مضامین لکھنے کی خواہش ایک عرصے سے رہی ہے۔ میں جب لوگوں کے خاکے پڑھتا تو میرے دل میں یہ خیال آتا کہ میں بھی کچھ لکھ سکتا ہوں۔ لیکن کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ جب میں نے معروف مکالمہ نگار جناب جاوید صدیقی کے خاکوں کا مجموعہ ''روشن دان'' پڑھا تو میری خواہش کو بال و پر لگ گئے۔ دل نے میرے اندر کے قلمکار سے کہا کہ قلم اٹھالے۔ تو اگر جاوید صدیقی جیسا نہیں لکھ سکے گا تو کوئی بات نہیں، بہت سے نام نہاد خاکہ نگاروں سے تو اچھا ہی لکھ لے گا۔ لیکن پھر بھی اس کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس درمیان کافی دن گزر گئے۔ اچانک ''روشن دان'' ایک بار پھر میرے ہاتھوں میں آگئی اور میں نے پھر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ نثر کی بہت کم کتابیں میں نے دوبارہ سہ بارہ پڑھی ہیں۔ ایسے مصنفوں میں ابن صفی نمبر ایک پر ہیں۔ دوسرے نمبر پر مشفق خواجہ ہیں اور تیسرے نمبر پر جاوید صدیقی ہیں۔

مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ جب جب میرے ذہن میں خاکے لکھنے کی خواہش

بیدار ہوتی تو کئی چہرے نگاہوں میں گھوم جاتے۔ ان میں سب سے پہلا چہرہ ہمارے گاؤں کے محمد عمر پردھان کا ہوتا۔ ان کی شخصیت میں اتنی دلکشی و دلنوازی تھی اور اس کے ساتھ ہی اتنا بانکپن تھا کہ نہ جانے کیوں ان کا خاکہ لکھنے کو میں بے چین رہتا۔ وہ ہمارے آبائی گاؤں میں ہمارے پڑوسی رہے ہیں۔ ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت میں مجھے بڑی کشش نظر آتی۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی مشاق اور ماہر خاکہ نگار ان کا خاکہ لکھتا تو مجھ سے کہیں بہتر لکھتا۔ دوسری شخصیت صحافت میں میرے معنوی استاد جناب محفوظ الرحمٰن صاحب کی رہی۔ ان پر بھی خاکہ نما لکھنے کی خواہش میرے دل میں رہی ہے۔ ایک اور شخصیت موہن چراغی کی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ان پر ایک مضمون لکھا تھا۔ لیکن یہ مضمون اس سے الگ ہے۔ اگرچہ سابقہ مضمون کے کچھ حصے اس میں ضرور آگئے ہیں۔ اس درمیان میرے والد گرامی، بڑے بھائی اور ایک بھائی اور دوست کا بھی انتقال ہو گیا۔ میں نے ان تمام شخصیات پر قلم اٹھایا اور جو کچھ بن پڑا آپ کے سامنے ہے۔

میں ایک صحافی ہوں اور صحافت اور میڈیا کے موضوع پر میری کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب ان تمام کتابوں سے الگ ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ قارئین اس کتاب پر ضرور اظہار خیال کریں۔ کتاب اچھی لگی یا بری، اس میں خوبیاں ہیں یا خامیاں، وہ جیسا محسوس کریں ویسا اظہار کریں۔ ان کی تنقید بھی میرے لیے اصلاح کا کام کرے گی۔

محتاج دعا
سہیل انجم

☆☆

پیش لفظ

منظور عثمانی

مطلع صحافت پر ۱۹۸۵ میں نمودار ہونے والا انجم (سہیل) اخبار بینوں کے لیے بڑا جانا بوجھا نام ہے۔ گونا گوں موضوعات پر ان کے مضامین کی زد سے ملک سے نکلنے والا شاید ہی کوئی موقر جریدہ محفوظ رہا ہو۔ راقم الحروف کی علیک سلیک ان سے چھ سات سال قبل ہی ہوئی ہے۔ پہلی ہی دید وشنید سے اچھے بھی لگے۔ خوش اطوار، خوش گفتار اور شگفتہ مزاج۔ ایسے لوگ نظر انداز بھی نہیں کیے جاسکتے۔ چونکہ ہم دونوں ہی ''او کھلے'' میں سر دیے ہوئے ہیں اس لیے راہے گاہے ٹکراتے بھی رہے۔ موصوف اکثر نام نہاد قلمکاروں کی مانند ''ان پڑھ'' نہیں ہیں۔ اس لیے جب بھی ملتے احقر کے کسی نہ کسی انشائیے کے حوالے سے داد تحسین سے بھی نوازتے۔ چونکہ پیشے سے ''مخبر'' ہیں اس لیے ''خلاف معمول'' باخبر بھی رہتے ہیں۔

خوشا نصیب کہ یہ دیوانہ لوح وقلم ایک دن اچانک میری دیوار تک آ پہنچا اور اس نے اپنی تازہ ترین ضخیم کتاب ''مطالعات'' سے بھی نوازا۔ ورق گردانی سے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ آپ کی پہلی تصنیف ''بازیافت'' مطبوعہ ۲۰۰۵ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) کے بعد سے یہ ان کی پندرہویں تخلیق ہے۔ ان کے علاوہ بھی ''رحمِ طباعت'' میں تین اور کتابیں کلبلا رہی ہیں جن کی تولید سعید عنقریب ہونے والی ہے۔ بھلا ''سرعت'' کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے:

لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

چونکہ سہیل انجم سخت گیر اور محکم گیر کے قائل ہیں اس لیے انھوں نے چند دنوں کے بعد

جب غریب خانہ پر دوبارہ قدم رنجہ فرمایا تو حسب سابق خالی ہاتھ اس بار بھی نہیں تھے۔ ''نقش بر آب'' (شخصی خاکے) کا مسودہ ساتھ تھا۔ چلتے چلتے حکم صادر ہوا کہ کتاب پر ''مقدمہ'' بھی دائر کرنا ہے۔ دعویٰ اس قدر زوردار تھا کہ ہاں کرتے ہی بن پڑی۔

''نقش برآب'' ایسے بارہ مرحومین کے خاکے ہیں جو مصنف کے بیچ میں آئے جن میں سے چندان کے مستقبل پر انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ پہلے ''شان کج کلاہی'' دوسرے ''صبر و شکر کی مورت'' اور تیسرے ''اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے'' آپ کے والد محترم جناب ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم، چھوٹے دادا نواب بخش اور بڑے بھائی حماد انجم کے پر اثر اور لاجواب خاکے ہیں۔ ایک خاکہ آپ ہی کے گاؤں کے عمر پردھان کا ''تھوڑی شرافت زیادہ شرارت'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں عمر پردھان کے پردے میں آج کے گرگٹ صفت اور بہروپیے نیتاؤں کی خوب خوب خبر لی گئی ہے۔ اس خاکے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سہیل انجم طنز و مزاح کی طرف رخ کریں تو اس میدان میں بھی جھنڈے لہرائے بغیر نہیں رکیں گے۔ یوں بھی ان کی طبعی خوش مزاجی اور شگفتہ تحریر اس کی غمازی کرتی ہے۔

سہیل انجم ایک نابغۂ روزگار، عالم بے بدل اور ہمہ جہت شخصیت کے فرزند ہیں۔ ان کے والد ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم بیک وقت شاعر، خطیب، طبیب، صاحب طرز قلمکار، صحافی، بیباک سیاست داں اور جانے کیا کیا تھے۔ سہیل انجم میں عظیم باپ کی بہت سی خوبیاں ودیعت ہوئی ہیں۔ اپنے پیشے کے تئیں والہانہ اور مخلصانہ انہماک اور بیبا کی ان کے خون میں شامل ہے۔ مضامینِ نو بہ نو کے انبار اسی تخلیقی شورش کا نتیجہ ہے جو انھیں ہر دم بے چین رکھتی ہے۔

باقی مضامین ان شخصیات پر ہیں جن سے اپنے وطن اور پھر دہلی کی صحافتی زندگی میں وہ رابطے میں آئے۔ ان میں دو شخصیات ایسی ہیں جو ان کے کریئر کو بنانے میں کافی اثر انداز ہوئیں۔ عظیم صحافی محفوظ الرحمٰن اور سہیل انجم کے رفیق کار ظفر عدیم۔ بالخصوص محفوظ الرحمٰن۔ محفوظ صاحب سے آپ خصوصی طور سے متاثر ہیں۔ ایک طرح سے محفوظ صاحب ان کے رول ماڈل ثابت ہوئے جنھوں نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی۔ شروع سے ہی سہیل صاحب محفوظ الرحمٰن صاحب کی ''بارعب شخصیت اور ہمہ شیشہ، ہمہ مینا، ہمہ جام'' کے سے مزاج سے متاثر تھے۔ ان

کے ساتھ کام کرنے کی چاہ نے انھیں ہفت روزہ ''ہمارا قدم'' کی معقول تنخواہ کو لات مار کر محفوظ صاحب کے بے سروسامان و بے وسائل ''اپنا ہفت روزہ'' جوائن کرنے پر مجبور کیا۔ جہاں اگر چہ انھیں بے اندازہ مالی تنگ دستی سے دوچار ہونا پڑا لیکن محفوظ صاحب کی صحبت نے ان کی فطری صلاحیت کو جلا ہی نہیں بخشی بلکہ صحافتی زندگی کو نیا موڑ بھی دیا۔ انہی کے ایما اور تجویز پر انھوں نے میڈیا کے موضوع پر اپنی پہلی کتاب کا عنوان ''میڈیا روپ اور بہروپ'' رکھا۔ محفوظ صاحب ہی کے مشورہ پر انجم صاحب نے میڈیا کو اپنا موضوع بنایا جس کے نتیجے میں میڈیا اور صحافت پر ان کی کتابیں ''میڈیا روپ اور بہروپ''، ''مغربی میڈیا اور اسلام''، ''میڈیا اردو اور جدید رجحانات'' اور ''احوال صحافت'' عالم وجود میں آئیں۔ عظیم صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط پر ان کی دو کتابیں بھی اسی جذبے کی دین ہیں۔ ان کے علاوہ ''دہلی کے ممتاز صحافی'' نامی ان کی کتاب کو دہلی اردو اکادمی نے اپنے سلسلہ مطبوعات کے تحت چھاپا ہے۔ دو اور کتابیں ''صحافت کے فروغ میں علما کا کردا'' اور ''ہندوستان میں دینی مجلّات کی صحافتی خدمات'' عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔

آج اردو میڈیا میں سہیل انجم کا نام معتبر ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ انھیں اس ڈگر پر ڈالنے والے محفوظ الرحمٰن ہی ہیں جس کے لیے اردو دنیا کو مرحوم کا ممنون احسان ہونا چاہیے۔ محفوظ الرحمٰن نے ان کی تحریروں پر کئی بار اپنی پسندیدگی کا اظہار اس طرح بھی فرمایا ''پڑھ کر ایسا لگا جیسے میں نے ہی لکھا ہے''۔ انجم صاحب کے حج نامہ ''پھر سوئے حرم لے چل'' کا سہرا بھی محفوظ صاحب ہی کے سر جاتا ہے۔

محفوظ صاحب نے سہیل انجم کی کردار سازی میں بھی بڑا اہم رول ادا کیا۔ خود ان کی ہی زبانی سنیں:

> ''ایک بار میری عدیم الفرصتی پر انھوں نے نصیحت کی کہ سہیل انجم صاحب یہ بات ذہن میں بٹھا لیجیے کہ اس لائن (صحافت) میں آپ کی جتنی رگڑائی ہوگی آپ کے قلم میں اتنی ہی چمک پیدا ہوگی۔ محنت سے گھبرایئے اور بھاگیے نہیں۔ وہ جتنی محنت آپ سے لیں آپ کیجیے۔ اس کا فائدہ بعد میں آپ کو ملے گا''۔

آگے چل کر سہیل انجم معترف ہیں:

''واقعی اس رگڑائی نے کام کرنے کی میرے اندر ایسی عادت ڈال دی کہ اگر میرے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے تو میں بیمار پڑ جاتا ہوں''۔

محفوظ صاحب نے ان کے اصرار پر ان کی کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' پر جو تاثراتی مضمون قلمبند کیا ہے اس میں وہ ان کی صحافت کی ستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''سہیل انجم نے حقائق کی تہہ تک اتر جانے کی جس غیر معمولی صلاحیت، جزرسی اور نکتہ سنجی ونکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اگر موجودہ حالات میں بالکل ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ وہ برسہابرس تک صحافت کے خارزار میں اپنے تلووں کو لہولہان کرتے رہے ہیں۔ وقت کی چلچلاتی دھوپ میں وہ ایک مدت تک کسی شجر سایہ دار یا سائبان کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحمل، یہ قوت برداشت، ہر تلخ بات کو نرم لہجے میں کہہ ڈالنے کی غیر معمولی صلاحیت اور تنقیص کے بجائے صحت مند تنقید کی ڈگر پر چلتے چلے جانے کا جو حوصلہ ان کی کتاب کے سطور اور بین السطور دونوں میں ہی پوری قوت کے ساتھ جھلکتا ہے، غالباً انہی دنوں کی دین ہے''۔

محفوظ صاحب پر ان کا خاکہ قابل مطالعہ ہے۔ ان کی شخصیت پر اتنے جامع اور بھرپور خاکے کی شکل میں نذرانۂ عقیدت وہی شخص پیش کر سکتا ہے جس کا روم روم اس عظیم ہستی سے عقیدت کی حد تک پیار کرتا ہو۔

دوسری شخصیت جس نے ان پر چھاپ چھوڑی وہ ان کے رفیق کار ظفر عدیم مرحوم کی ہے۔ عدیم صاحب کے تئیں ان کی توصیف کے پیچھے وہ فکر کارفرما ہے جو صحافت کے بارے میں خود ان کا اپنا مطمح نظر ہے۔ دونوں کے خیال میں آج کا المیہ یہ ہے کہ آج کی صحافت ادب سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ صحافت بھی ایک ادب ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا رنگ ہو۔ عدیم صاحب کا یہ خیال ہے:

''بیشک صحافت بھی ایک ادب ہے بشرطیکہ صحافی مولانا آزاد کی صحافت کو

سمجھنے کی کوشش کریں۔لیکن صدمے کی بات یہ ہے کہ اردو ادب کے علمائے کرام نے ادب پر تنقید و تحقیق کو لاد کر نہ صرف ادب سے انسانی جذبات کو چھین لیا بلکہ اس کے اثر سے صحافت بھی رفتہ رفتہ ادبیت سے محروم ہوتی چلی گئی۔صحافت میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ اس میں انسانی جذبات کی ایک موج تہہ آب موجود ہو۔اگر صحافت کو صرف ''خبر نگاری'' یا سیاسی یا واقعاتی موضوع کو حالات حاضرہ کے تشریحی خاکے تک محدود کر دیا جائے تو یہ نتیجہ ہوگا کہ صحافت میں ادبی چاشنی ختم ہو جائے گی۔تب صحافی کے نجی جذبات نیوز اور میڈیا کے مروجہ آئٹموں سے مغلوب ہو جائیں گے''۔

چنانچہ کم و بیش آج صحافت کی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔

سہیل انجم ایسے صحافی نہیں جو صرف نیوز ڈیسک سے وابستگی کے باعث ہی جرنلسٹ کہلاتے ہوں۔ان کے یہاں علم و آگہی ہے، وسیع مطالعہ ہے اور زبان و بیان پر بھرپور قدرت ہے۔ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی ہے اور برمحل اشعار کا استعمال ان کے مضامین کو وقار بخشتا ہے۔انسانی جذبات کی موجِ تہہِ آب ان کو معاصرین میں منفرد مقام دلاتی ہے۔

اصغر گونڈوی نے اپنے بارے میں کہا تھا:

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں جانا
اشعار میں کہتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

اسی طرح گو سہیل انجم سے ملنا یقیناً خوشی کی بات سہی، لیکن ان کو اگر دیکھنا ہے تو ہر جینوئن قلمکار کی طرح وہ اپنی تحریروں میں نمایاں نظر آئیں گے خصوصاً زیر نظر خاکوں میں۔پڑھ کر دیکھیے یہ خاکے ایک طرح سے شفاف آئینہ ہیں جن میں سہیل انجم کی بھرپور شخصیت جھلکتی نظر آئے گی۔یہ خاکے بیک وقت آپ بیتی، باپ بیتی اور جگ بیتی ہیں۔اس پر مستزاد ان کی بصیرت افروز تشریحات اور ذاتی نقطہ نظر۔گویا اس مختصر سی کاوش کو آسانی سے آل ان ون (All In One) کہا جا سکتا ہے۔

سہیل انجم کی ''سریع القلمی'' دیکھ کر مشہور نقاد، محقق اور تخلیق کار جناب وہاب اشرفی

سے متعلق ایک لطیفہ یاد آگیا۔ آپ نے اپنی متعدد تصانیف کے بارے میں کسی محفل میں یہ انکشاف فرمایا کہ میرے قلم سے نکلی ہوئی کتابوں کا وزن مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ بات ہمارے درویش صفت مزاح نگار جناب اسرار جامعی کے پلے پڑ کر یوں ہوگئی:

سمینار میں جب کہا اشرفی نے
سنیں سامعیں جو میں کہتا ہوں سچ ہے
لکھیں میں نے اتنی کتابیں ادب کی
کہ ہے وزن جن کا زیادہ ہی مجھ سے
سنا جامعی نے تو بولے کہ بیشک
ہوئے آپ اپنی کتابوں سے ہلکے

ہماری بھی سہیل انجم کے لیے رشک آمیز دعا ہے کہ وہ اتنی کتابیں لکھیں جو ان کے وزن سے کئی گنا بڑھ جائیں لیکن ان تخلیقات کی وجہ سے وہ ہلکے نہیں بلکہ اور بھاری ہو جائیں۔ (آمین)

قارئین کو ہماری صلاح ہے کہ وہ "نقش بر آب" ضرور پڑھیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس کا مطالعہ نقش بر آب نہیں بلکہ نقش بر سنگ ثابت ہوگا۔

☆☆

دل میں اترتی کتاب

راشدہ اشرف، کراچی

خاکہ نگاری کی تاریخ کے بارے میں معروف ادیب اور خاکہ نگار خاطر غزنوی لکھتے ہیں "اردو میں خاکہ نگاری کی روایت ہمیں قدیم تذکروں میں ملتی ہے۔ پرانے تذکرہ نگار شعرا کے بارے میں عام طور پر چند گی چنی سطریں لکھا کرتے تھے۔ اردو کے تذکرے فارسی زبان میں ہی ہوا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اردو کے قدیم ترین تذکروں میں خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار" اور افضل بیگ کاکشال کا "تحفۃ الشعراء" قابل ذکر ہیں۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ۱۱۶۵ء ایک نہایت اہم سال ہے۔ اس سال میر نے اپنا مشہور و معروف تذکرہ نکات الشعراء تالیف کیا تھا"۔

خاطر غزنوی نے جدید دور کی خاکہ نگاری کے آغاز کا سال ۱۹۳۶ء کو قرار دیا ہے۔ جبکہ ۱۹۳۹ء میں چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ" شائع ہو چکی تھی جو خاکہ نگاری کی صنف میں ایک انتہائی اہم مقام رکھتی ہے۔ اسی طرح ۱۹۳۷ء میں سید عابد حسین نے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے گیارہ ریڈیائی خاکوں پر مشتمل کتاب "کیا خوب آدمی تھا" شائع کی تھی اور اس کے دو برس بعد ۱۹۴۳ء میں بشیر احمد ہاشمی نے "گفت و شنید" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس سے قبل فرحت اللہ بیگ نے "نذیر احمد کی کہانی" اور "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ" میں اور رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" میں فن خاکہ نگاری کو ایک نمایاں مقام عطا کیا تھا۔ جون ۱۹۳۶ء میں پروفیسر شجاع احمد خاں زیبا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں قلمی خاکے کے

عنوان سے ایم اے کا مقالہ تحریر کیا تھا۔ بعد ازاں اس صنف ادب میں پاک و ہند میں چند ایک مقالے لکھے گئے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ابھی اس میدان میں تحقیقی کام کی بہت گنجائش باقی ہے۔

پروفیسر افتخار اجمل شاہین کے بقول ''اب تک لوگ سوانح عمری، شخصیات نگاری، سیرت نگاری، یادداشتوں اور مرقع نگاری کو خاکہ نگاری کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔ ہم خاکے کی مختصر تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہ وہ مختصر مضمون ہے جس میں خاکہ نگار اپنے مطلوبہ خاکے (شخصیت) کے تمام خدوخال نمایاں نہیں کرتا بلکہ مخصوص الفاظ اور مخصوص انداز میں اس شخصیت کے ان ہی خدوخال کی تصویر پیش کرتا ہے۔ جس سے اس کے مخصوص اور مطلوبہ ظاہری اور باطنی نقوش موثر انداز میں ابھر کر سامنے آجائیں''۔

پروفیسر شاہین کی بیان کردہ اس کڑی تعریف کو کسوٹی مان کر شخصی خاکوں کے مجموعوں کو پرکھا جائے تو بہت کم مجموعے ایسے ہوں گے جو اس تعریف پر پورے اتریں گے۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض مجموعوں میں خاکہ نگار نے اپنی ذات کو بھی نہایت تفصیل سے پیش کیا ہے اور خاکے سے زیادہ ان میں سوانحی عنصر نمایاں ہو چلا ہے۔

پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شخصی خاکہ نگاری کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ مختلف لکھنے والوں نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور خوب دلجمعی سے لکھا ہے۔ چند مثالوں میں عبدالرزاق کانپوری، مالک رام، جگن ناتھ آزاد، بیگم انیس قدوائی، انیس چشتی، ڈاکٹر اعجاز حسین، کشمیری لال ذاکر، نند کشور وکرم، شمیم حنفی، اطہر پرویز، عابد سہیل، عارف جمیل، علی جواد زیدی، غلام رضوی گردش، پروفیسر اطہر صدیقی، ماہ منیر خان، محمد ثناء اللہ عمری، حکیم امامی، شرف الدین ساحل، مرزا جعفر حسین، نسیمہ تراب الحسن، معصوم مراد آبادی، انور ظہیر خان، باقر مہدی، اسلوب احمد انصاری، اشفاق حسین، ایم طیب انصاری، مجتبیٰ حسین، منور رانا، پروانہ ردولوی، جگر بریلوی، حامد اللہ ندوی، حسن الدین احمد، حفیظ نعمانی، خواجہ غلام السیدین، رام لعل، سید محمد حسنین، امان اللہ خان شیروانی اور مظفر گیلانی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اور اب خاکہ نگاری کی صنف ادب میں ایک اہم اضافہ کرتی، فن خاکہ نگاری کے بنیادی تقاضوں پر پوری اترتی، مذکورہ بالا جید حضرات کی فن خاکہ نگاری سے متعلق کلیدی بیانات

سے میل کھاتی، زیرِ نظر کتاب ''نقش بر آب'' اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ سہیل انجم نے تحریر کردہ ہر خاکے کے کلیدی کردار کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ لیکن قریب سے ان شخصیات کا قد انھیں اور بھی نکلتا ہوا نظر آیا ہے۔ شاید یہی بات ان کرداروں کو مرکزِ توجہ بنانے کا جواز ہے۔

کتاب میں شامل تمام شخصیات کا انتخاب مصنف کے ذاتی تعلقات اور ان کی پسند کے مطابق ضرور ہے لیکن ان سے متعلق جو لکھا گیا ہے، کھل کر لکھا گیا ہے۔

اس موقع پر راقم کو ڈاکٹر شمیم ترمذی یاد آرہے ہیں جنھوں نے ایک کتاب کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ''لگتا ہے کہ یادیں جس ترتیب سے ذہن میں آتی چلی گئیں، مصنف بلا کم و کاست لکھتا چلا گیا۔ اِن رواں دواں تحریروں سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ مصنف نے نظرِ ثانی کا تکلف بھی نہیں کیا مبادا تحریر کا فطری بہاؤ متاثر ہو''۔

''نقش بر آب'' مذکورہ بالا تعریف پر یقیناً پوری اترتی ہے۔

یہاں ڈاکٹر ترمذی کا وہ بیان بھی نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''آخر یاد ہے کیا؟ پہلا خیال تھا کہ یاد محض انسانی ذہن کے پردے پر متحرک تصویروں کی کمنٹری ہے جو ذہن اور زبان کے درمیانی فاصلے کو کم کردیتی ہے اور کمنٹری سننے والا شخص، دوسرے کا ذہن پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن کمنٹری تو ہمیشہ ایک سیدھی لکیر پہ چلنے والی شے ہے اور یہ بات یاد کو بے لچک اور بے رس بنانے والی ہے جبکہ یادیں ایسی نہیں ہوتیں۔ پھر سوچا کہ یاد شاید fantasy ہوتی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کیونکہ یاد کا تعلق تصور و تخیل سے نہیں، حقیقت سے ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی یادوں کو تصوراتی البم بنا کر پیش کرتے ہیں، وہ یادوں کے حقیقی بیان سے گریز کرتے ہوئے یادوں کی تخلیق میں لگ جاتے ہیں جو کسی طور بھی درست نہیں۔ اب میں نے سوچا کہ یادوں کو کمنٹری کی تہمت سے بچانے

اورانھیں تخیلی مرصع کاری سے دور رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یاد کو ایسی کیفیت کہا جائے جس میں انسان ماضی کو romanticize کرتا ہے اور یادوں کو ادبی لمس دینے والا فن کار، دلچسپ اور دل پذیر اسلوب میں، دوری ترتیب سے بے نیاز ہو کر، ماضی کے اُن منتخب واقعات اور کرداروں کو ضبطِ تحریر میں لاتا ہے جو آج کے انسان کو جینے کا حوصلہ دیں، جو ایجابی اقدار کی قندیل سے حال کی تاریک راہوں کو روشن کر دیں''۔

سہیل انجم کی اس کتاب میں شامل پہلا خاکہ ''شان کج کلاہی'' ہے۔ یہ مصنف نے اپنے والد محترم ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم پر لکھا ہے۔ یہ ایک دل گداز تحریر ہے۔ راقم کی نظر سے مختلف لکھاریوں کے اپنے والدین پر لکھے کئی خاکے گزرے ہیں۔ مگر زیرِ تذکرہ خاکہ کچھ الگ ہی ڈھنگ سے لکھا گیا ہے۔ ایک بیٹے نے اپنے خوددار باپ کی زندگی کی جیسی عکاسی کی ہے، اسے پڑھ کر دل سے ڈاکٹر انجم کے لیے بے اختیار دعائے مغفرت نکلتی ہے۔ یہی ایک کامیاب تحریر کا وصف ہے۔ جو دل کو چھو جائے، جو آنکھ کو نم کر دے۔

کتاب میں شامل زیادہ تر خاکے ایسی شخصیات پر لکھے گئے ہیں جو عام انسان ہیں، ہمارے آپ کے جیسے۔ دوران مطالعہ یہ لوگ ہمیں اپنے چاروں طرف چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ کہنے کو ایک عام آدمی...... مگر وہ جن سے زندگی جلا پاتی ہے۔ جینے کا حوصلہ بڑھتا ہے۔

خاکہ جتنا سادہ ہو، اتنا اچھا۔ زیب داستان سے جتنا گریز برتا جائے، اتنا بھلا۔ راقم الحروف نے ''نقش برآب'' کے مطالعے کے دوران یہی محسوس کیا۔

''صبر و شکر کی مورت''، ''اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے'' اور ''تھوڑی شرافت زیادہ شرارت'' بھی عام لوگوں کے خاکے ہیں۔ ان کی سطر سطر دل میں اترتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں صلے کی پروا رہی، نہ ستائش کی تمنا۔ یہ کہنے کو تو مصنف کے اقربا ہیں مگر کیا یہ میری اور آپ کی کہانی نہیں ہے؟ ایک عام آدمی کی کہانی۔ خدا نہ کرے کہ ہم اور آپ خود کو ''خاص'' لوگوں میں شمار کریں۔ ایسا کرنے سے، ایسا ہونے سے انسان اپنا آپ کھو بیٹھتا ہے۔

کتاب میں شامل ایک خاکہ ''عقیدت کی شبنم'' بھی ہے۔ اسے راقم نے نہایت دلچسپی سے

پڑھا اور محظوظ ہوا۔ مذکورہ خاکے میں نہ صرف سہیل انجم کی صحافتی زندگی کی جدوجہد کی ایک واضح شکل ابھر کر سامنے آتی ہے بلکہ دوران ملازمت ان کے ساتھیوں کی شخصیتوں سے، ان کے رویوں سے بھی پردہ اٹھتا ہے۔ مذکورہ خاکے میں سہیل انجم ان سبھوں کو تیز روشنی میں لاتے ہیں۔

میں بوجوہ دیگر خاکوں پر بات نہیں کرنا چاہوں گا۔ ان میں شامل ہیں محمود الحسن انصاری، ظفر عدیم، محمد یوسف خاں درانی، عادل اسیر دہلوی، مولانا محمود الحسن فیضی اور پروفیسر شعیب اعظمی کے خاکے و تذکرے۔ وجہ سیدھی سی ہے۔ قاری اور کتاب کے درمیان زیادہ دیر حائل ہونا کیا کوئی مناسب بات ہے؟ آپ خود ہی فیصلہ کیجیے۔

zest70pk@gmail.com

☆☆

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس جہان فانی میں اک تغیر کے سوا کسی چیز کو ٹھہراؤ نہیں، کسی شے کو استقلال نہیں۔ کون ہے جو اس کے دستبرد سے محفوظ ہے، کون ہے جو اس کی زد پر نہیں۔ انسان تو انسان عہد بھی فنا ہو جاتے ہیں، تاریخیں بھی مٹ جاتی ہیں۔ ایک عالم کو حیران کر دینے والے کارنامے زینتِ طاقِ نسیاں بن کر خود صورت حیرت بن جاتے ہیں اور اپنے ہنر میں طاق مانے جانے والے بے ہنری کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز انسان اپنے عہدوں سے ''عہدِ وفا'' باندھنے کے باوجود جب تغیر کے نشانے پر آتے ہیں تو ان کے بھی نام و نشان مٹ جاتے ہیں اور ان کے عہدوں کے بھی۔ جب وقت کی آندھی چلتی ہے تو وہ فلک بوس عمارتیں جن کو دیکھنے کے لیے سر سے ٹوپیاں گر پڑتی تھیں، ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ جو بہت جی دار ہوتی ہیں وہ کھنڈروں کا قالب اوڑھ لیتی ہیں اور سیاحوں کے لیے نشان عبرت بن کر زندہ رہتی ہیں۔ جن بادشاہوں کی فتوحات کتابِ وقت کا سرنامہ ہوتی تھیں انھیں تاریخ کے اوراق پر بھی ثبات نہیں ملتا۔ جنگ میں بہادر دشمن کا پتا پانی کر دینے والی آبدار تلواریں زنگ کے ہاتھوں شرمسار ہو کر پانی پانی ہو جاتی ہیں اور عجائب گھروں میں بزدلوں کے لیے بھی تماشہ بن جاتی ہیں۔ ہاں وہ نقوش مندمل نہیں ہوتے جن میں خون جگر کی آمیزش ہو۔ ان نفوس قدسیہ کی یادیں نہیں مٹتیں جو نفس کے نہیں بلکہ مالک انفس و آفاق کے غلام ہوں۔ ان سروں کی شانِ کج کلاہی نہیں جاتی جو صرف خالق حقیقی کے آگے جھکنا جانتے ہوں کسی اور کے آگے نہیں۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

☆☆

مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم

(شانِ کج کلاہی)

فروری ۲۰۱۳ء کے پہلے ہفتے میں ابا کی طبیعت بگڑ گئی۔ بڑے بھائی جناب حماد انجم صاحب ایڈووکیٹ نے فون کر کے اطلاع دی اور کہا کہ فوراً گھر آجاؤ، ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ۷ فروری بروز جمعرات ظہر سے قبل دہلی سے گھر پہنچا۔ برآمدے کے باہر راستے کے کنارے دھوپ میں تخت بچھا ہوا تھا جس پر ابا لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے پہنچ کر سلام کیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے خیریت پوچھی۔ انھوں نے 'الحمد للہ' کہا۔ وہ بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ رک رک کر ہلکی آواز میں سائیں سائیں کر کے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے بھائی آصف ہلال انجم اور ہمارے بہنوئی عبدالقادر ان کو دوا پلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانچ منٹ کے بعد ابا نے مجھ سے پوچھا:

''آپ کون ہیں؟''

''سہیل ہوں، دلی سے آرہا ہوں''۔

ایک بار پھر انھوں نے مصافحہ کیا، مسکراتے ہوئے کیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ کیا۔ کافی دیر تک ہاتھ پکڑے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے قبل گاؤں کے ہی ایک ڈاکٹر انور علی صاحب ان کو گلوکوز چڑھا رہے تھے جو اس وقت روک دیا گیا تھا۔ کچھ دوائیں بھی دی تھیں۔ جسم پر جگہ جگہ بڑے بڑے پھپھولے پڑ کر پھوٹ گئے تھے۔ منہ میں بھی بری طرح

چھالا پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے کوئی چیز حلق سے نیچے نہیں جا رہی تھی۔ آصف ہلال نے بتایا:

''دو تین روز سے ابا نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ حلق سے نیچے کوئی چیز نہیں جا رہی ہے۔ کمزوری بہت زیادہ بڑھ گئی ہے''۔

ابا کو لٹا دیا گیا۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ ڈاکٹر نے انھیں نیند کی دوا دے دی۔ وہ سو گئے۔ جب وہ تکلیف کی شدت سے بے چین ہو جاتے تو پھر انھیں نیند کی دوا دے دی جاتی۔ دوا کا اثر کم ہوتا تو ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آتے۔ وہ بار بار کروٹ بدلتے اور پیشانی پر ہتھیلی رکھ دیتے۔ کچھ پوچھنے پر پیشانی اور سینے کی طرف اشارہ کرتے۔

گاؤں کی روایت کے مطابق بہت سے لوگ جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی، ان کو دیکھنے آنے لگے۔ ابا نیم وا آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتے اور پھر آنکھ موند لیتے۔ گویا کہہ رہے ہوں:

دیکھ لینا مریض فرقت کو
رسم دنیا بھی ہے ثواب بھی ہے

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کس ذہنی کشمکش میں ہوں گے۔ وہ اتنے حیادار تھے کہ کبھی کسی غیر خاتون کے سامنے نہیں آتے تھے اور گھر میں آنے والی خواتین سے پردہ کر لیتے تھے، وہ اب عیادت کو آنے والی عورتوں کے ہجوم میں چار پائی پر لیٹے رہنے پر مجبور تھے:

دل کی الجھن نہ پوچھیے امید
ہم نہ خلوت کے ہیں نہ محفل کے

جمعہ کے روز تکلیف زیادہ بڑھ گئی اور جمعہ کی نماز کے بعد دونوں پیروں کے پنجے ٹھنڈے ہو گئے۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو مایوسی کا اظہار کیا۔ اس درمیان ہم لوگ ان کو گورکھپور کے کسی اسپتال میں لے جانے پر غور کر رہے تھے۔ راجوری، جموں سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر شمس کمال انجم کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ ہفتے کو دس گیارہ بجے صبح پہنچ گئے۔ ان کے آتے ہی ابا کو گورکھپور لے جایا گیا۔ ہمارے ایک بھائی قمر جمال انجم اس وقت جدہ میں تھے۔ ان کے علاوہ باقی ہم چار بھائی پہنچ گئے تھے۔ مجھے چھوڑ کر تین بھائی ابا کے ساتھ گورکھپور گئے۔

جس اسپتال میں داخل کرایا گیا اس میں وہ تین روز رہے۔ ایک روز میں بھی گیا اور

شام تک واپس آ گیا۔ دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ ابا کو بہت زیادہ تکلیف تھی۔ ان کے اور ہم لوگوں کے دوست احباب کو خبر لگنے لگی اور اسپتال میں لوگوں کا تانتا لگ گیا۔ بیمار پرسی کے لیے اسپتال آنے والوں میں گورکھپور شہر کے متعدد احباب اور رشتہ داروں کے علاوہ پڑتاول بازار گورکھپور سے مولانا عبدالواجد فیضی اور ان کے ادارے کے رفقاء، جھنڈانگر نیپال سے مولانا عبداللہ مدنی کی ہدایت پر ان کے بھائی زاہد آزاد جھنڈانگری اور ان کے کئی رفقاء اور روزنامہ راشٹریہ سہارا گورکھپور کے ایڈیٹر مظفر اللہ صاحب قابل ذکر ہیں۔

وہاں بھی ان کی حالت بگڑتی ہی رہی۔ بڑے بھائی حماد انجم صاحب کی اہلیہ، ہمارے پھوپھی زاد بھائی محمد اسلم کی اہلیہ اور ہماری ایک بہن وہاں ان کے بیڈ پر مسلسل رہیں اور ان کی خدمت کرتی رہیں۔ اس درمیان ابا کی آنکھیں زیادہ تر بند ہی رہیں۔ ان سے جب بھی خیریت پوچھی گئی انھوں نے کہا ''ٹھیک ہوں'' یا محض اشارہ کر دیا۔ حالانکہ ان کو بے حد تکلیف تھی۔ وہ اپنی خدمت میں رہنے والوں کے ہاتھ مروڑ دیتے۔ وہ لوگ کہنے لگے:

''ایسا لگتا ہے جیسے ابا کو کتنی طاقت آ گئی ہے''۔

میں نے کہا ''یہ طاقت نہیں ہے بلکہ تکلیف کی شدت ہے۔ ایسی تکلیف جو ناقابل برداشت ہے''۔

ڈاکٹروں نے کئی ٹیسٹ کیے۔ شوگر بڑھی ہوئی تھی۔ گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ وہیں پتہ چلا کہ دماغ میں Blood Clotting ہے، خون جما ہوا ہے۔ ڈاکٹروں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ لیکن یہی کہتے رہے کہ ان کو لکھنؤ پی جی آئی لے جایئے۔

میں ۱۲ فروری کو دہلی کے لیے چلا اور ۱۳ کی صبح یہاں پہنچا۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر اس دوران خدانخواستہ کچھ انہونی ہو گئی تو میری اہلیہ کو بہت شدت سے اس کا احساس ہوگا، وہ زندگی بھر اس غم کو بھول نہیں پائیں گی۔ اس لیے میں ان کو لینے کی نیت سے حماد بھائی سے اجازت لے کر دہلی آیا تھا۔

۱۲ کو ہی رات میں انھیں وہاں سے نکال کر گورکھپور اور قرب و جوار میں شہرت رکھنے والے ڈاکٹر عزیز احمد کے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ میں نے ان کے دوست مولانا عبداللہ مدنی جھنڈا

نگری کو نیپال میں فون کیا۔ ان سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر عزیز سے فون پر بات کریں۔ انھوں نے وعدہ کیا۔ لیکن شاید ان کی بات نہیں ہو سکی۔ ڈاکٹر عزیز کے اسپتال کا تجربہ بہت خراب رہا۔ نہ کوئی ڈاکٹر ٹھیک ڈھنگ سے دیکھتا اور نہ ہی کوئی بات بتائی جاتی۔ یہاں تک کہ اسپتال میں داخل کرتے وقت جس ڈاکٹر نے فارم پر دستخط کیے تھے وہ دو دن کے قیام کے دوران ایک بار بھی نہیں آیا۔

بہر حال ۱۳ فروری کی رات میں ابا پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اسی رات ان کو گھر لے آیا گیا۔ پندرہ کی صبح کو میں اپنی اہلیہ کو لے کر بذریعہ طیارہ لکھنؤ گیا اور وہاں سے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ پندرہ کی شام کو ہم گھر پہنچ گئے۔

برآمدے میں ابا کی چارپائی بچھی تھی۔ ان پر بے ہوشی طاری تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا اور منہ سے ہی سانس کی آمد و شد جاری تھی۔ وہ بہ زبان خاموشی کہہ رہے تھے:

مرے مرنے سے کچھ پہلے صف ماتم بچھا دینا
کہ میں بھی دیکھ لوں کس کس کی چشم نم برستی ہے

موسم خراب ہو گیا تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ابا کی چارپائی کے چاروں طرف عورتیں، بچے اور بڑے مسلسل قرآن شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔ ۱۴ فروری سے ہی تلاوت کا سلسلہ جاری تھا۔

ابا اگرچہ بے ہوش تھے لیکن ان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ آنکھیں نیم وا تھیں۔ کبھی کبھار پتلیاں ذرا سی حرکت کرتیں جس سے زندگی کی علامت ظاہر ہو جاتی۔ اور بس۔ ان کی جان پتلیوں میں آ کر اٹک گئی تھی۔ ان کے حلق میں چمچے سے پانی ڈالا جا رہا تھا۔

ہم لوگ دوسرے کمرے میں غمزدہ حالت میں بیٹھے تھے۔ میری اہلیہ نے مجھے بلا کر کہا کہ:

''ارے آپ بھی اس آخری وقت میں ابا کے حلق میں پانی ڈال دیجیے''۔

''مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں جب بھی ان کا چہرہ دیکھتا ہوں ان کی تکلیف کا احساس ہونے لگتا ہے اور میں بے چین ہو جاتا ہوں''۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

دل بجھا شمع کائنات گئی
زندگی کی اجالی رات گئی

انھوں نے مجھے سہارا دیتے ہوئے ابا کی چارپائی کی طرف کر دیا۔ میں نے دو تین قطرے پانی کے ڈالے اور پھر میں آبدیدہ ہوگیا۔ واپس کمرے میں چلا آیا۔

''یا اللہ ابا پر رحم کر، ان کی مشکل آسان کر دے''۔ شمس کمال نے غمزدہ انداز میں کہا۔ ہم لوگوں نے آمین کہا۔ ظاہر ہے آثار سے یہی لگ رہا تھا کہ اب یہ آخری وقت ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ حالت کب تک رہے گی۔ ۱۶ فروری کی صبح بھی وہی کیفیت رہی۔ موسم اور خراب ہوگیا تھا۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ بارش کا سلسلہ اور تیز ہوگیا تھا۔ ہم لوگ بار بار یہی دعا کرتے کہ یا اللہ ہمارے ابا کی مشکل آسان کر۔

''ابا وقت کھینچ رہے ہیں۔ اگر ابھی خدا نہ کرے کچھ ہو جائے تو اس موسم میں کیا کریں گے''۔ بھائی حماد انجم نے کہا اور کئی بار کہا۔

میں نے دہلی میں ڈاکٹر حلیم کوثر چاند پوری کو فون کر کے کیفیت بتائی اور یہ جاننا چاہا کہ ''کیا ایسے میں امید کی کوئی کرن ہے اور کیا یہ کوما کی حالت تو نہیں؟''۔

انھوں نے کہا ''یہ آخری وقت ہے۔ آپ نے جو پوزیشن بتائی ہے اس سے لگتا ہے کہ یہ حالت نزع ہے اور کچھ نہیں۔ یہ کوما نہیں ہے صرف اور صرف نزع کی کیفیت ہے''۔

''ڈاکٹر صاحب یہ کیفیت کب تک رہ سکتی ہے''۔ میں نے سوال کیا۔

''یہ تو اللہ جانتا ہے کہ وہ کس کو کب تک زندہ رکھے گا اور کب تک حالت نزع میں رکھے گا۔ بس آپ لوگ ان کے حق میں دعا کیجیے، قرآن پڑھیے''۔ انھوں نے کہا۔

یہ رات بھی اسی عالم بے قراری میں گزر گئی کہ لوگ جاگ رہے ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں۔ کبھی ایسا لگتا جیسے ان کی سانس چھوٹی ہو رہی ہے۔ کبھی سانس کی آواز تیز ہو جاتی اور ایسا لگتا جیسے کراہ رہے ہیں۔ پورا گھر عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا تھا۔ چاروں طرف سناٹے اور ہو کا عالم۔ نہ کسی سے کچھ بولا جا رہا تھا نہ کچھ سوجھ رہا تھا۔ نہ کھانے کا خیال نہ کسی دوسری چیز کا احساس۔ ناقابل بیان بے بسی کا عالم۔ خدا کے آگے انسان کی بے چارگی اور بے کسی کیا ہوتی

ہے اس کا احساس ہو رہا تھا۔ بے کسی ہائے تمنا اور بے بسی ہائے تماشہ والا معاملہ تھا۔

انسان کسی کسی معاملے میں کیسا لاچار ہو جاتا ہے اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں بار بار گونج رہی تھی کہ جس کی جتنی زندگی ہے وہ پوری ہو کر رہے گی۔ جتنی سانسیں لکھ دی گئی ہیں وہ مکمل ہو کر رہیں گی۔ اگر کوئی چاہے کہ وقت سے پہلے دنیا سے چلا جائے تو ناممکن ہے۔ اسی کے ساتھ متعینہ وقت کے بعد دنیا میں رکنا بھی ناممکن ہے۔ تمام تر سہولتیں بیکار اور تمام تر تدبیریں لایعنی۔ اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی چلی ہے نہ چلے گی۔

۷ فروری کی صبح ہو گئی۔ ابا کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ قرآن مجید کی تلاوت جاری رہی۔ حلق میں پانی ٹپکانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ سوا سات بجے تک بچے ان کی چارپائی کے اردگرد رہے۔ حماد بھائی کی بیوی یعنی ہماری بھابھی تھوڑی دیر کے لیے اٹھیں اور گھر میں جھاڑو دینے لگیں۔ سب مسلسل دو تین رات کے جاگے ہوئے تھے۔ ہماری بہن نے کہا کہ وہ ذرا پانچ منٹ کمر سیدھی کر لیں۔ ہماری اہلیہ کو کوئی وہاں سے یہ کہہ کر لے گیا کہ چلو دو گھونٹ چائے پی لو۔ پانچ منٹ کے لیے ابا اکیلے ہو گئے۔ بھابھی جھاڑو دیتے ہوئے ابا کی چارپائی کے پاس سے گزریں تو ان کو کچھ سناٹا محسوس ہوا۔ ایسا لگا کہ کھر کھراہٹ کے ساتھ سانس چلنے کی آواز جیسے تھم گئی ہو۔ انھوں نے پاس جا کر دیکھا تو سانس کی ڈور ٹوٹ چکی تھی۔ وہ قید حیات و بند غم سے آزاد ہو چکے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جسم ساکت ہو گیا تھا۔ انھوں نے چیخ کر آواز دی۔ ہم لوگ پہنچ گئے۔ آن کی آن میں زبردست بھیڑ لگ گئی۔

صبح کے تقریباً ساڑھے سات بجے تھے۔ دو دن سے بے حد خراب رہنے والا موسم بہتر ہو گیا تھا۔ بارش بند ہو گئی تھی۔ سرد ہواؤں کا سلسلہ رک گیا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔

حماد بھائی نے کہا: ''جب ابا حیات تھے اور ہم لوگ ان سے کہتے کہ ابا کہیں جایئے گا نہیں۔ وہ کہتے ہاں کہیں نہیں جاؤں گا۔ لیکن جوں ہی نظر چوکی وہ گھر سے باہر۔ چپکے سے نکل جاتے۔ آج پھر انھوں نے وہی کیا۔ تین روز سے لوگ ان کے اردگرد بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ حلق میں پانی ڈال رہے تھے۔ لیکن آج صبح جوں ہی غفلت ہوئی، لوگوں کی نظر چوکی، وہ خاموشی سے نکل گئے اور دنیا کو ہی خیرباد کہہ دیا''۔

انھوں نے یہ بھی کہا ''آپ لوگ دو تین دن سے پریشان تھے۔ اگر یہ حادثہ کل ہوا ہوتا تو سوچو کتنی پریشانی ہوتی۔ ابا نے زندگی میں اپنی ذات سے ہم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ آخری وقت میں بھی انھوں نے وہی کیا۔ آج موسم بہتر ہو گیا اور آج وہ چلے گئے''۔

اس طرح ہمارے خاندان کی تاریخ کا ایک بہت اہم باب بند ہو گیا۔ ان کے جانے سے نہ صرف ہمارے گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤوں کی رونق بھی ختم ہو گئی۔ اس علاقے میں ان کی شخصیت ایک نمایاں حیثیت کی حامل تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کے انتقال کی خبر پورے ملک کے علمی حلقے اور اردو اخبارات کے دفتروں میں پہنچ گئی۔ لوگوں کی فون کالس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعد نماز ظہر تدفین کا وقت مقرر کیا گیا۔ مگر پانچ چھ گھنٹے کے اندر اندر قرب و جوار کے علاوہ گورکھپور، سدھارتھ نگر، بستی، سنت کبیر نگر اضلاع اور ہند نیپال سرحد کی دونوں جانب سے بڑی تعداد میں لوگ پہنچ گئے۔ جس کو جو سواری ملی اسی سے آ گیا۔ گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا تانتا لگ گیا۔ ایک مدرسے کے اساتذہ اور طلبہ بس لے کر آئے۔ پھر تو 'کاندھے پہ لیے سب اہل جنوں بسمل کا جنازہ جاتے ہیں'۔

گاؤں میں ابا کے قائم کردہ مدرسہ مدینۃ العلوم کے صحن میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ شمس کمال نے نماز پڑھائی۔ اور اس طرح عبدالحمید انجم جمال اثری حامد الانصاری انجم نامی بلبلِ ہزار داستان منوں مٹی کے نیچے سو گیا:

سوائے خاک کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے
زمیں سے دب گئے دبتے جو آسماں سے نہ تھے

گاؤں کے لوگوں نے بتایا کہ اس سے قبل ہمارے گاؤں میں کسی کے انتقال پر اس قدر اژدحام نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ اس روز اس علاقے میں تین تین میتیں ہوئی تھیں۔

اسی دن سے متعلقین، ابا کے دوستوں اور احباب جماعت اور ان کے مختلف اداروں کی جانب سے تعزیتی نشستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کئی دنوں تک جاری رہا۔

ان کے انتقال کی خبر سن کر سب سے پہلے ہمارے گھر آنے والوں میں ہمارے گاؤں ہی میں میڈیکل پریکٹس کرنے والے ڈاکٹر پانڈے تھے۔ وہ ابا کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

ان کا پہلا جملہ تھا: ''مولانا کے دیہانت سے ایک یگ کا انت ہو گیا''۔

انھوں نے ابا کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔

''ابھی چند روز قبل ان کو ایک لڑکا ہاتھ پکڑے میرے مطب پر لایا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے ہاتھ پکڑ کر کیوں لا رہے ہو تو مولانا نے کہا میں ادھر جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ مجھے ڈاکٹر پانڈے کے گھر پہنچا دو وہاں سے میں چلا جاؤں گا۔ میں نے پھر مولانا کے لیے چائے منگوائی اور پھر ایک بچے کے ساتھ انھیں گھر بھیجا''۔ ڈاکٹر پانڈے کا مطب بازار میں واقع ہے اور وہیں قریب سے گاؤں میں جانے کا راستہ ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے وہ بہت زیادہ خوش و خرم رہنے لگے تھے۔ بچوں کو بلاتے اور سامنے کھڑا کر کے ہنسنے لگتے۔ اپنی پرانی نعتیں جو یاد آ جاتیں گنگناتے۔ کبھی وضو کرتے اور دیر دیر تک نمازیں پڑھتے۔ ایک روز رات کے کھانے کے بعد آصف ہلال نے ان سے نعت پڑھنے کی فرمائش کی۔ یادداشت تو ٹھیک تھی ہی نہیں۔ جہاں جہاں سے اشعار یاد آتے اپنے مخصوص ترنم میں پڑھنے لگتے۔

''وہ اشعار سنایئے جو آپ اکثر و بیشتر اپنی تقریروں کے آخر میں ترنم سے پڑھتے تھے''۔ آصف نے فرمائش کی۔

''کون سے اشعار؟''۔ ابا نے پوچھا۔

''وہی۔ اے خدا جسم میں جب تک کہ مری جان رہے''۔ آصف نے کہا۔

''ہاں ہاں! ٹھیک ہے۔ وہی پڑھتا ہوں''۔ ابا نے خوش ہو کر کہا۔ انھوں نے ترنم سے پڑھنا شروع کیا:

اے خدا جسم میں جب تک کہ مری جان رہے
تجھ پہ صدقے ترے محبوب پہ قربان رہے

''بابو اور کیسے ہے میں تو بھول گیا''۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

سب لوگ ہنس پڑے۔ پھر آصف ہلال ایک ایک مصرعہ پڑھتے جاتے اور وہ ترنم سے سناتے جاتے:

اے خدا جسم میں جب تک کہ مری جان رہے
تجھ پہ صدقے ترے محبوب پہ قربان رہے
دل وہی دل ہے کہ جس دل میں ہو الفت تیری
جاں وہی جان ہے جس میں ترا ارمان رہے
کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دعا ہے کہ امیر
نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

یہ واقعہ مرض الموت سے تقریباً پندرہ دن قبل کا ہے۔ آصف ہلال نے ان اشعار اور دوسرے اشعار کو بھی موبائل میں محفوظ کر لیا تھا جسے بعد میں ہم لوگوں نے اپنے اپنے موبائلوں میں محفوظ کیا۔

آخری دنوں میں ایک اور شعر وہ بار بار پڑھتے رہے۔ کبھی ہماری بھابھی کو بلا کر ان کے سامنے پڑھتے تو کبھی کسی بچے کے سامنے پڑھتے۔ اس شعر میں بڑا سوز ہے، بڑا گداز ہے، بڑا درد ہے۔ وہ شعر ہے:

التجا تجھ سے ہے ترحُم کی
لاج رکھ لے غریب انجم کی

ادھر جب سے ان کے ذہن اور یادداشت نے جزوی طور پر ان کا ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا انھوں نے شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ لیکن آخری دنوں میں ان کی زبان سے بار بار پڑھا جانے والا یہ شعر دراصل ان کی زندگی کا آخری شعر ہے اور ان کی حالت کا عکاس بھی ہے۔

گزشتہ کچھ برسوں سے ابا کا رشتہ لوح وقلم سے منقطع ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً تین دہائی قبل ایک دردناک حادثے کے سبب ذہنی و دماغی اضطراب میں مبتلا تھے اور اپنی علمی سرگرمیوں سے بدرجہ مجبوری کنارہ کش تھے۔ ایک طرح سے وہ اس دوران علمی دنیا سے کٹے رہے اور بظاہر ''گمنامی'' کی زندگی گزارتے رہے۔ لیکن ان کے انتقال سے پورے ملک کے اخباروں میں اور بالخصوص جماعت اہلحدیث کے رسالوں اور جریدوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہندوستان کے تقریباً تمام اردو اخباروں اور بعض انگریزی اور ہندی کے اخباروں نے بھی ان کے انتقال کی خبر اور تعزیتی نشستوں کی رپورٹیں تواتر کے ساتھ شائع کیں اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی۔

متعدد سیاسی، دینی وادبی مجلوں اور رسالوں نے ان پر اداریے اور خصوصی مضامین شائع کیے۔

ابا کو پروسٹیٹ کا مرض تھا۔ اسپتال وغیرہ سے گھبراتے تھے۔ زندگی میں کبھی کسی اسپتال کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ پروسٹیٹ کے آپریشن کے لیے تیار نہیں تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے پیشاب خانے میں سرخی مائل پیشاب دکھائی دینے لگا۔ بعض اوقات خون کے قطرے بھی نظر آتے۔ لیکن جب بھی ابا سے معلوم کیا جاتا تو ان کا یہی جواب ہوتا:

''میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، اللہ کا فضل وکرم ہے''۔

اس سے قبل کئی بار ان کی بلڈ شوگر بھی ٹیسٹ کرائی گئی لیکن شوگر کبھی نہیں نکلی۔ البتہ دماغی کیفیت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

اس کے اصل سبب کا علم اسپتال میں داخل کیے جانے کے بعد ہوا جب سی ٹی اسکین سے پتہ چلا کہ دماغ میں دو جگہ خون کے تھکے جمے ہوئے ہیں۔ تب جا کر احساس ہوا کہ ہم لوگ جسے ان کی ضعیفی کی وجہ سے نسیان کا غلبہ سمجھ رہے تھے وہ دراصل یہی بیماری تھی۔

ان کے رہن سہن کے انداز میں کئی برسوں سے بدلاؤ آ گیا تھا۔ کبھی کسی جانب نکل جاتے اور کبھی کسی جانب۔ کبھی راستہ بھول جاتے۔ جان پہچان کے لوگ ان کو گھر چھوڑ جاتے۔ سردیوں میں کبھی ایک ہی پیر میں دونوں موزے پہن لیتے اور جب انھیں بتایا جاتا تو ہنستے ہوئے کہتے کہ 'ہاں یہ تو ایسے ہو گیا' پھر اتار کر دونوں میں پہنتے۔

اکتوبر ۲۰۱۲ء میں دہلی آئے تھے۔ یہاں بھی یہی کیفیت رہی۔ بار بار باتھ روم کا راستہ بھول جاتے اور کپڑوں میں ہی پیشاب ہو جاتا۔ لیکن کبھی کسی کا ذہن اس جانب نہیں گیا کہ دماغی خرابی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے بلکہ سب آسیبی کیفیت سمجھتے رہے۔ اس کی ایک معقول وجہ بھی تھی۔ تقریباً تین دہائی قبل انھوں نے ہند نیپال سرحد پر واقع ایک گاؤں تمہوا نیپال میں ایک سنسان سی جگہ پر ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی۔ گاؤں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ وہاں جنوں کی آبادی ہے۔ وہاں مدرسہ مت کھولیے۔ لیکن ابا اپنے فیصلے پر اٹل رہے اور مدرسہ قائم کر کے چھوڑا۔ وہ دراصل بہت بہادر طبیعت کے تھے۔ ٹھوس اور پختہ عقیدے کے مالک۔ ایسی باتیں ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ مدرسہ کی تعمیر کے دوران ہی ان کے ساتھ کچھ عجیب وغریب اور غیر معمولی

قسم کے واقعات ہونے لگے۔ کبھی چارپائی الٹ جاتی تو کبھی ان کا چشمہ کھو جاتا جو بعد میں مل جاتا۔

مدرسہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد جب وہاں تعلیمی سلسلہ شروع ہو گیا تو ایک رات نصف شب کے بعد انھیں پیشاب کی حاجت ہوئی۔ لنگی بنیان میں مدرسے کے صحن میں سوئے ہوئے تھے۔ لوٹا لے کر اٹھے اور کھیت میں، وہاں کوئی پیشاب خانہ نہیں بنا تھا، جانے لگے۔ لیکن ان کے قدم کہیں رکے ہی نہیں۔ وہ چلتے رہے اور چلتے ہی رہے۔ کبھی کسی گڈھے میں گرتے تو کبھی کسی کیچڑ میں۔ چشمہ وشمہ پتہ نہیں کہاں گر گیا۔ بعد میں انھوں نے روداد بتائی جس کے مطابق وہ چلتے چلتے تھک جاتے تو بیٹھ جاتے لیکن ایسا لگتا جیسے کوئی طاقت انھیں اٹھا رہی ہے اور پھر وہ چلنے لگتے۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ چشمہ کھو گیا اور پورے جسم پر کیچڑ اور مٹی لت پت ہو گئی۔ بتاتے تھے کہ جیسے کوئی انھیں کیچڑ میں پٹک پٹک کر اور لپیٹ لپیٹ کر مار رہا ہے۔ سورج نکلنے والا تھا۔ لیکن ان میں اتنا ہوش نہیں رہ گیا کہ وہ صحیح سمت کا اندازہ لگا پاتے۔ چشمہ بھی نہیں تھا کہ ٹھیک سے کچھ دیکھ سکتے۔ وہ اسی عالم دیوانگی میں ایک طرف چلے جا رہے تھے کہ صبح کے وقت بھینس چرانے والے کچھ افراد نے انھیں دیکھا اور ڈر کر بھاگنے لگے۔ جس پر ابا نے انھیں آواز دی۔ کسی طرح وہ کنارے آئے تو دیکھا کہ یہ تو مولانا انجم صاحب ہیں۔

انھیں فوراً اسی مدرسے پر لے جایا گیا۔ نہلایا دھلایا گیا اور ایک چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ بہت شدید بخار چڑھا۔ انھیں لے جا کر ایک اسپتال میں دکھایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ انھیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس بخار ہے جو دوا سے ٹھیک ہو جائے گا۔ بعد میں کسی بڑے عامل سے مشورہ کیا گیا تو اس نے بتایا کہ یہ سلوک جنوں نے ان کے ساتھ کیا ہے۔ اور وہ بھی بچوں نے۔ جنوں کے مطابق وارننگ دینے کے باوجود مولانا نے ہماری آبادی پر مدرسہ کھول دیا۔ ہم کیا کرتے۔ اگرچہ یہ بہت بڑے عالم دین ہیں مگر ان کو سبق سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ کچھ دنوں تک جنوں کے کچھ بچے ان کے ہمراہ رہا کرتے تھے لیکن اب ان کا ساتھ چھوڑ دیا گیا ہے۔

ابا اس کے علاوہ ایک اور حادثے سے دوچار ہوئے تھے اس کا بھی اثر ان کی دماغی کیفیت پر رہا۔ سماجوادی پارٹی کے صدر ملائم سنگھ یادو نے ۱۱، اکتوبر ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں ایک بڑی ریلی کا انعقاد کیا تھا۔ ابا چونکہ سیاسی آدمی بھی تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنے بعض ساتھیوں

کے ساتھ اس میں شرکت کا پلان بنایا۔ وہ لوگ ایک بس کرائے پر لے کر گئے۔ واپسی میں رات کا وقت تھا۔ بس کے اندر تاریکی تھی۔ صرف ہیڈ لائٹس جل رہی تھیں۔ اچانک بس کے آگے کوئی چیز آئی اور بس زبردست جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ کئی لوگوں کو معمولی چوٹیں آئیں۔ ابا کی ناک سامنے کی سیٹ کے لوہے کے راڈ سے زور سے ٹکرا گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بس چل پڑی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ابا کو اپنے چہرے اور کپڑے پر کچھ نمی کا احساس ہوا۔ انھوں نے بس رکوائی۔ دیکھا تو خون سے کرتے کا پورا دامن تر بتر ہے۔ خون صاف کیا گیا مگر اس کے نکلنے کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ بس چل پڑی۔ ابا خاموشی سے بیٹھے رہے۔ صبح کے وقت دیکھا گیا کہ کرتے کا پورا دامن اور پائجامہ اور رومال سب خونم خون۔ رات کی تاریکی میں بہت زیادہ خون گرا۔ لیکن احساس نہیں ہوا۔

ابا بتاتے تھے کہ اس کے بعد سے ان کی یادداشت کمزور پڑنے لگی اور صحت بھی متاثر ہونے لگی۔ لیکن اس بات کو انھوں نے کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس کا کوئی علاج کرایا۔ ہماری اماں بھی بتاتی تھیں کہ اس واقعہ کے بعد تمھارے ابا کچھ بھولنے لگے تھے۔ اندیشہ ہے کہ بہت زیادہ خون گر جانے کی وجہ سے ان کے دماغ پر اثر پڑا ہوگا۔ آخری عمر میں ادھر ادھر بھٹکنے کو ہم لوگ ان دونوں واقعات کا نتیجہ قرار دیتے لیکن کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ کسی اسپتال میں انھیں دکھایا جائے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ خود کو چاق و چوبند اور صحت مند بتاتے اور پوچھنے پر یہی کہتے کہ اللہ کا فضل و کرم ہے، میں بہت اچھا ہوں، کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔

مذکورہ دونوں واقعات ان کی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ گئے۔ ان واقعات کو ان کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کے لیے خطرناک موڑ تصور کیا جانا چاہیے۔ ورنہ ان کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ دعوتی و تبلیغی جلسے میں بلائے جاتے تو تین تین چار چار گھنٹے بیک نشست تقریر کرتے۔ وہ اکثر کہتے: ''جب بولتے بولتے میری کمر میں درد ہونے لگتا ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ تین گھنٹے ہوگئے۔ بارہا اس کا تجربہ گھڑی دیکھ کر کیا ہے''۔

انھوں نے یہ بات کئی بار بتائی تھی کہ سورہ اخلاص پر ان کی تقریر چھ گھنٹے کی ہے۔ تین چار گھنٹے تک تقریر کرتے ہوئے تو ہم لوگوں نے بھی سنا تھا۔

''تین گھنٹے سے زیادہ مجھ سے بلوانا ہو تو ہر آدھے آدھے گھنٹے پر چائے دیا کیجیے اور مجھے بلواتے رہیے''۔

چائے بے حد میٹھی پیتے لیکن انتقال سے تقریباً ایک سال قبل تک ان کو شوگر نہیں تھی۔ چائے کے ایسے شوقین کہ اخباروں میں اگر کسی نئی چائے کا اشتہار دیکھ لیتے تو اسے ضرور منگاتے خواہ پارسل سے ہی کیوں نہ منگوانی پڑے۔ مجھے یاد ہے انھوں نے ''لمسا'' اور ''لاسا'' چائے پارسل سے منگوائی تھی۔

چائے صرف پینے کے ہی شوقین نہیں تھے بلکہ پلانے کے بھی تھے۔ جب دو تین ماہ پر مدرسے سے گھر آتے تو ان کے دوست احباب کی آمد شروع ہو جاتی۔ دن بھر گاؤں کے مدرسے پر رہتے اور رات میں کھانا کھانے کے بعد گھر پر مجلس جمتی۔ ان دنوں ہمارے علاقے میں بجلی نہیں آئی تھی۔ مٹی کا دیا جلتا تھا۔ کھانا پکانے کے لیے عام طور پر پتے اور کبھی کبھار لکڑی استعمال ہوتی تھی۔ لیکن مجلس جمنے پر سب کے لیے چائے ضروری ہوتی۔ چاہے پتے اور کاغذ جلا کر ہی کیوں نہ بنانی پڑے۔ ان دنوں عموماً دودھ نہیں ملتا تھا۔ اب بھی نہیں ملتا۔ مگر اب پاؤڈر کا دودھ استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت وہ بھی خریدنے کی اوقات نہیں تھی۔ اس لیے کالی چائے بنتی اور اس میں لیموں نچوڑنے کی عیاشی کی جاتی۔ چائے پینے کے لیے کپ بھی کافی نفیس استعمال کرتے۔ کہیں کسی جگہ انھیں شیشے کے کپ میں چائے پینے کو ملی۔ وہ کپ ان کو بہت پسند آیا۔ مختلف شہروں اور قصبوں میں شیشے کے کپ ڈھنڈھواتے رہے۔ بالآخر گورکھپور یا لکھنؤ سے منگوا کے چھوڑا۔ سعودی عرب میں ہمارے علاقے کے کسی گاؤں کا کوئی شخص ملازمت کرتا تھا اس تک سے کہا کہ آنا تو وہاں سے شیشے کے کپ لیتے آنا۔ ان دنوں دو چار دس گاؤں کا کوئی ایک شخص خلیج میں ملازمت کے لیے جاتا تھا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ خود ہمارے گاؤں میں کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس کے دو ایک لوگ خلیجی ملکوں میں ملازمت نہ کر رہے ہوں۔ اور شیشے کے کپوں کی بھی بھر مار ہے۔ جب کوئی دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے نظر آتا تو اسے آواز دیتے اور کہتے: ''آؤ آؤ سادہ شربت پی کے جاؤ''۔

وہ از راہ تفنن طبع کنویں سے تازہ بھرے ہوئے پانی کو سادہ شربت کہا کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے گاؤں میں نل نہیں ہوتا تھا۔ دو چار کنویں تھے جن سے پہلے مٹی کے گھڑے سے اور

جب ذرا کچھ پیسہ لوگوں کے پاس آیا تو پیتل کے گھڑے سے پانی نکالا جاتا تھا۔ ہینڈ پمپ وغیرہ بہت بعد میں لگے۔

برادرم حماد انجم نے اپنے ایک مضمون میں ابا کی شخصیت کا سراپا یوں کھینچا ہے: ''وہ کمال کے آدمی تھے، غضب کی شخصیت تھی، بے مثال ہستی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی میں نے ابا کا جلال و جمال دیکھا۔ کبھی شعلہ کبھی شبنم۔ کبھی ریشم کبھی آہن۔ کبھی سیماب تو کبھی سنگ خارا۔ کبھی طوفان سے قبل کی خاموشی تو کبھی خاموشی کے بعد کا طوفان۔ کبھی شان ترحم کا شاہکار تو کبھی غیظ وغضب کا پیکر۔ کبھی بالکل چپ چاپ تو کبھی انجمن بردوش۔ سکے کے دونوں رخ آمنے سامنے۔ دراز قد، نیم گداز جسم، گندمی مائل سانولا رنگ، خوب صورت چہرہ، مونچھوں کی علت سے پاک صاف بالائی لب، چہرے پر کالی سی تراش خراش کی مرہون منت داڑھی، آنکھوں پہ عینک، کان تک لٹکے ہوئے کالے کالے بال، قمیص یا کرتا پائجامہ اور کبھی اس پر شیروانی یا صدری، سر پر خوب صورت اونچی مخملی ٹوپی، خوش پوشاک، نفیس اور سلیقہ مند، حسن و جمال کا مرقع، مردانہ وجاہت قدم قدم ہمرکاب، تیز رفتار، آگے آگے چلنے کی خو، گویا کوئی کارواں سالار۔ یہ ہے الفاظ کے آئینے میں ابا کی قلمی تصویر''۔

ابا نے پوری زندگی مدارس کے قیام، ان کے انتظام وانصرام اور تعلیم وتعلم میں گزاری۔ لیکن کبھی اس کو دولت کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا جیسا کہ آجکل کے نظماء کرتے ہیں۔ وہ اکثر دعا کرتے کہ یااللہ مدارس کو امداد کی شکل میں ملنے والے پیٹرو ڈالر سے بچا۔ کیونکہ عام طور پر ایک طرف سے دولت آتی ہے تو دوسری طرف سے ایمان چلا جاتا ہے۔ یااللہ پیسہ کبھی میرا ایمان خراب نہ کرے۔

گھر سے ایسے بے نیاز کہ جب مدرسہ چلے جاتے تو گھر بھول جاتے۔ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہاں ان کے بیوی بچے بھی ہیں۔ ہماری والدہ کس کس طرح کام کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھیں اس کا انھیں احساس ہی نہیں تھا۔ ان دنوں ٹیلی فون وغیرہ تو تھے نہیں کہ چلو بات کرلو۔ خط بھی نہیں لکھتے۔ لیکن جب مدرسہ سے گھر آجاتے تو پھر مدرسے کو بھول جاتے۔ پھر دو دو تین تین مہینے گھر ہی پڑے رہتے۔ مجلسی آدمی تھے جہاں بیٹھ گئے دن دن بھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ لوگ آرہے

ہیں جا رہے ہیں، گپ شپ ہو رہی ہے، چائے کا دور چل رہا ہے۔

ہمارے گاؤں سے تین کلو میٹر مشرق میں ایک جگہ سانتھا بازار ہے جہاں سے سڑک گزرتی ہے۔ یہ سڑک جنوب کی طرف خلیل آباد ہوتے ہوئے ایک طرف بستی اور دوسری طرف گورکھپور چلی جاتی ہے اور شمال کی جانب بانسی ہوتے ہوئے نوگڑھ اور ککرہوا سے گزرتے ہوئے نیپال کے قصبہ لمبنی کی جانب جاتی ہے۔ وہیں بس ملتی ہے۔ پہلے گاؤں سے سانتھا تک کچا راستہ تھا۔ برسات کے دنوں میں تقریباً نصف راستے میں پانی بھر جایا کرتا۔ لوگ پانی میں سے ہو کر آتے جاتے۔ شدید بارش کے دنوں میں پورا راستہ ہی ڈوب جاتا اور کمر کمر تک پانی میں آنا جانا پڑتا۔

ابا کو جس دن مدرسے جانا ہوتا اس سے ایک روز قبل خوب تیاری ہوتی۔ کوئلے کی پریس رکھتے تھے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا کہ کوئلہ نہیں ہے۔ ایسے مواقع پر وہ کرتا پائجامہ تہہ کر کے رات میں تکیہ کے نیچے رکھ دیتے۔ صبح کو وہی پہن کر سانتھا جاتے۔ کوئی دوسرا شخص ان کا بیگ لے کر جاتا۔ بس اسٹینڈ کے پاس ہمارے خاندان کے ایک صاحب کی سائیکل کی دکان تھی جن کا نام حفیظ اللہ تھا۔ وہ رشتے میں ہمارے دادا لگتے تھے۔ وہاں چائے وغیرہ کی بھی دکانیں تھیں اور دوسری ضروری چیزیں بھی مل جایا کرتی تھیں۔ ابا حفیظ اللہ دادا کی دکان پر بیٹھ جاتے۔ ان کے پہنچتے ہی وہ اپنے بیٹوں کو پکار کر آوازِ لگاتے:

"ارے سبحان اللہ دیکھو مولانا انجم صاحب آئے ہیں جلدی سے چائے وائے لاؤ"۔

"چائے تو پئیں گے ہی ذرا بیٹھ جانے دو"۔ ابا جواب دیتے۔

دو چار کرسیاں لگ جاتیں، مجلس جم جاتی۔ بسیں ایک تو بہت کم آتی تھیں اور جو آتی تھیں وہ بھی بہت تاخیر سے۔ جہاں ایک دو گھنٹے ہوئے موڈ بگڑ گیا۔ اب بس آئے یا نہ آئے، اب نہیں جانا ہے۔ شام تک وہیں مجلس جمائے رہتے۔ کھانے کی سدھ کسے ہے۔ بس چائے ملنی چاہیے جو ہر آدھے گھنٹے پر ملتی رہتی تھی۔

مغرب کے بعد جب گھر پر گاؤں کے مدرسے کا کوئی لڑکا ابا کا بیگ لاتا تو سب سمجھ جاتے کہ آج ابا نے پھر جانا ملتوی کر دیا۔ ابا گاؤں کے مدرسے پر رک جاتے اور عشا کی نماز پڑھ

کرآتے۔یہ سلسلہ ہفتوں تک چلتا۔اکثروبیشتر وہ ہم لوگوں سے کہتے:

''ارے ریڈیو پر خبروں کا وقت ہو گیا یا نہیں''۔

''ہونے والا ہے ابا''۔کوئی جواب دیتا۔

''ذرا خبر لگانا''۔وہ خبروں کے شوقین تھے۔بی بی سی اردو سے روزانہ خبریں سننا ان کے معمول میں ایسے داخل تھا جیسے عبادت۔

اس دن آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والی خبر کا آخری حصہ ضرور سنتے اور توجہ سے سنتے۔ کیونکہ اسی حصے میں موسم کا حال بتایا جاتا تھا۔اگر خبر سے معلوم ہوا کہ کل موسم خراب رہنے کا اندیشہ ہے یا بادل وغیرہ چھائے رہیں گے تو فیصلہ ہو جاتا کہ کل مدرسہ نہیں جانا ہے۔جب بھی ایسا ہوتا اور اکثر ہوتا تو مدرسے کے ذمہ داران کسی کو ہمارے گھر بھیجتے جو اگلے روز ابا کو لے کر جاتا۔

وہ پہلے ہمارے گاؤں سے تقریباً سو کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہند نیپال سرحد کے قریب موضع ٹھوٹھری کے مدرسہ میں پڑھاتے تھے بعد میں سرحد کے اس پار یعنی نیپال میں ایک چھوٹے سے گاؤں ہرنام پور میں پڑھانے لگے۔وہ مدرسہ انھوں نے ہی ۱۹۷۷ء میں قائم کیا تھا۔ان کی زندگی کا بڑا حصہ انہی دونوں مدرسوں میں گزرا۔ان کے علاوہ بھی کئی مدرسے انھوں نے قائم کیے اور ان میں خدمات انجام دیں۔

ہرنام پور نیپال سرحد کے اندر واقع بودھوں کی مشہور عبادت گاہ ''لمبنی'' کے قریب ہے۔لمبنی کو گوتم بدھ کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے۔وہاں ایک بہت بڑا بودھ مندر ہے جس کا دروازہ لکڑی کا اور خاصا اونچا اور چوڑا ہے۔لوگ بتاتے ہیں کہ دروازے کی چوکھٹ میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ایک بار میں بھی اس مندر کو دیکھنے گیا تھا۔بہت غور سے دیکھنے پر بھی کہیں جوڑ کا نشان نظر نہیں آیا۔واقعی اس میں جوڑ نہیں ہے یا پھر میرے دل میں اس بات کے بیٹھ جانے کی وجہ سے مجھے جوڑ نظر نہیں آیا، میں کہہ نہیں سکتا۔

ہمارے یہاں سے تقریباً پچاس ساٹھ کلومیٹر کی مسافت پر اسی راستے میں ہر سال بارش میں کم از کم دو ایک فرلانگ تک سڑک کٹ جاتی ہے اور وہاں ایک بہت بڑا کنڈ بن جاتا ہے۔راستہ بند ہو جاتا ہے۔جس کو ادھر جانا ہو وہ گورکھپور ہوتے ہوئے جائے اور کئی گنا زیادہ

راستہ ناپے۔ بس وہیں تک جاتی پھر وہیں سے واپس آجاتی ہے۔ آس پاس کے لوگ کشتی وغیرہ سے آر پار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہر سال کا معمول ہے۔ جو بس صبح دس گیارہ بجے کے درمیان آتی اس کے ڈرائیور کا نام "مظہر" تھا۔ وہ بہت مقبول ڈرائیور تھا۔ برسوں سے اس روٹ پر چل رہا تھا۔ اس کی شہرت کی وجہ سے لوگ اس کی بس کو "مظہر میل" کہا کرتے تھے۔

ایک بار ابا نے مجھ سے کہا: "سہیل ذرا بتانا تو مظہر میل کتنے بجے آتی ہے"۔

میرے منہ سے بے ارادہ نکل گیا "کیا میں کنڈکٹر ہوں جو مجھے معلوم ہوگا"۔

بہت ناراض ہوئے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی تھی مجھے ایسا جواب تھوڑے ہی دینا تھا۔

اگلے روز مجھ سے بولے: "سانتھا جاؤ اور مظہر میل میں پتہ کرو کہ بس اس پار جارہی ہے یا ابھی وہیں تک جاتی ہے"۔

میں صبح ہی صبح نکل گیا۔ دو تین گھنٹے کے بعد بس آئی۔ میں نے ڈرائیور کی کھڑکی کے پاس جاکر پوچھا:

"مظہر میل بھائی! جہاں سڑک ٹوٹی ہے وہاں سے بس اس پار جارہی ہے یا نہیں"۔

"نہیں ابھی نہیں جارہی ہے" اس نے جواب دیا۔

"پھر لوگ اس پار کیسے جاتے ہیں"۔ میں نے پوچھا۔

"ہیلی کاپٹر سے جاتے ہیں"۔

"ہیلی کاپٹر سے جاتے ہیں؟"۔

"ہاں ہیلی کاپٹر سے جاتے ہیں"۔

"اچھا ٹھیک ہے"۔

پتہ نہیں اس نے غصے میں جھنجھلا کر کہا تھا یا ازراہ مذاق۔ وہ بہت پر مزاح بھی تھا۔ لیکن میں نے اس کے اس جواب کو سنجیدگی سے لیا۔ واپس گھر آکر ابا کو بتادیا کہ ہیلی کاپٹر سے لوگ اس پار جاتے ہیں۔ ایک بار پھر غصہ ہوئے اور کہنے لگے:

"تم بالکل بیوقوف ہو، وہاں ہیلی کاپٹر چلے گا، نالائق کہیں کے"۔

''مظہر میل تو یہی کہہ رہا تھا''۔

''اس نے کہا اور تم نے مان لیا''۔

اس وقت میری عمر یہی کوئی دس بارہ سال رہی ہوگی۔ میں ایک سیدھا سادا لڑکا تھا۔ ایسی باتیں سمجھ نہیں پاتا۔

ہمارے گاؤں سے سانتھا تک کے جس راستے کا ذکر ذرا پہلے آیا ہے وہاں اب پختہ سڑک بن گئی ہے۔ وہ سڑک دراصل ابا کی کاوشوں سے بنی ہے۔ سانتھا میں ایک نیتا تھے جن کا نام راکیش لال تھا۔ پرانے اور پکے کانگریسی۔ علاقے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ پرانے رئیس اور کافی دولت مند تھے۔ بڑے لحیم شحیم اور رنگ بالکل سیاہ۔ دور سے آرہے ہوں تو ایسا لگتا جیسے کوئی کالا دیو آرہا ہے۔ لیکن بے حد شریف آدمی تھے۔ ایک بار الیکشن کے موقع پر وہ کانگریس پارٹی کی طرف سے والد صاحب کے پاس تشریف لائے اور بولے:

''مولانا صاحب آپ کانگریس کے امیدوار کے حق میں ووٹ دینے کی اپیل کر دیجیے''۔

''راکیش صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ میں کانگریس کو پسند نہیں کرتا، پھر اپیل کیسے کردوں''۔

''مولانا صاحب کچھ بھی ہو آپ کو اپیل کرنی ہے، آپ جو کہیں وہ ہم آپ کو دیں گے''۔

''نہیں نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے''۔ انھوں نے غصے سے کہا۔

بہر حال تھوڑی دیر تک یہ باتیں چلتی رہیں۔ ابا نے دو چار منٹ تک سر جھکا کر غور کیا اور بولے: ''میں اپیل بھی کردوں گا اور امیدوار کے حق میں تقریر بھی کردوں گا''۔ نیتا جی بہت خوش ہوئے۔

''لیکن میری ایک شرط ہے''۔ نیتا جی نے شرط کا نام سنا تو تھوڑے گھبرائے۔ لیکن پھر نارمل ہو گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مولانا نے بہت سے امیدواروں کے حق میں تقریریں کی ہیں لیکن کسی سے ایک پیسہ نہیں لیا ہے۔

''آپ گھبرائیں نہیں، میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگوں گا، آپ تو جانتے ہیں کہ آج تک میں نے کسی سے کچھ نہیں لیا اور کئی امیدوار میری تقریروں کی وجہ سے جیت چکے ہیں''۔ ابا نے ان کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں مولانا میں تو جانتا ہوں کہ آپ نے آج تک کسی سے ایک دھیلا بھی نہیں لیا ہے۔ اچھا بتایئے آپ کی کیا شرط ہے''۔ راکیش لال نے کہا۔

''آپ سانتھا سے لے کر لوہرن بازار تک سڑک بنوا دیجیے، بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے''۔

''لیکن مولانا میں کیسے سڑک بنوا سکتا ہوں''۔

''جن کھیتوں میں سڑک منظور ہوئی ہے یا ہوگی وہاں تو آپ کے بھی کئی بیگھہ کھیت ہیں نا''۔

''ہاں ہیں تو''۔

''بس آپ اپنے کھیت میں مزدور لگوا کر سڑک کے لیے کھدائی شروع کروا دیجیے''۔

''ٹھیک ہے آپ کہتے ہیں تو میں کل سے یہ کام شروع کروا دیتا ہوں''۔

''اس کا اعلان آپ کو بازار کے دن کرنا ہوگا''۔

''ٹھیک ہے میں اعلان کردوں گا لیکن میری بھی ایک شرط ہے''۔

''اچھا آپ کی بھی شرط ہے بتایئے کیا شرط ہے''۔

''پرسوں منگل ہے، ہفتہ واری بازار لگے گا۔ بازار میں کانگریس کا اسٹیج لگے گا، جب بازار دھمک جائے (یعنی اپنے شباب پر آجائے) تب آپ تقریر کریں اور کانگریس کے امیدوار کے حق میں ووٹ دینے کی لوگوں سے اپیل کریں اسی وقت میں بھی اعلان کروں گا''۔

''ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا''۔

منگل کو ہمارے گاؤں میں ہفتہ واری بازار لگتا ہے جو آس پاس کے دو چار کوس میں سب سے بڑا بازار ہوتا ہے۔ اس بازار میں سات اطراف سے آنے کے راستے ہیں۔ اس بازار کی بڑی اہمیت ہے۔ کوئی بھی سامان کسی بھی قسم کا جو کہیں نہ ملتا ہو وہ اس میں مل جاتا ہے۔ مگر اب آس پاس کئی جگہ بازار لگنے کی وجہ سے اس کی وہ حیثیت نہیں رہ گئی۔

منگل کے روز بازار میں وقت مقررہ پر ایک بڑے مجمع کے سامنے ابا نے تقریر کی اور اس میں راکیش لال سے اعلان کروایا۔ اس موقع پر آپ نے از راہ مذاق راکیش لال کا کان بھرے مجمع میں پکڑ لیا اور بولے:

"آج تو میں ان کا صرف کان پکڑ رہا ہوں لیکن اگر انھوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو میں ان کا گریبان بھی پکڑنے کی جرأت رکھتا ہوں"۔

لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ ارے مولانا نے تو راکیش لال کا کان پکڑ لیا۔ رفتہ رفتہ اس واقعہ کی بڑی شہرت ہوئی۔ لوگ پہلے اظہار حیرت کرتے پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ مولانا کی طبیعت میں بڑا بانکپن ہے۔ انھیں کسی سے کیا ڈر۔

راکیش لال نے اگلے روز ہی اپنے مزدور لگوا کر سڑک بنوانی شروع کر دی۔ بعد میں سڑک منظور ہو گئی اور الیکشن کے بعد لوہرن سے سانتھا تک بن کر تیار ہو گئی۔ ان کا امیدوار بھی جیت گیا۔ یہی سڑک اب نہ صرف لوہرن بلکہ قرب و جوار کے تمام گاؤں کے لیے مرکزی شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے اردگرد مکانات کی تعمیر بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ سڑک کے نزدیک کی زمینوں کی قیمت سونے کے بھاؤ کی مانند چڑھ گئی ہے۔

راکیش لال کانگریسی نیتا تھے۔ ابا نے، کانگریس کے سخت مخالف ہونے کے باوجود کانگریس امیدوار کے حق میں محض عوامی مفاد کی وجہ سے پرچار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ابا مذہبی تقریروں کے ساتھ ساتھ سیاسی تقریریں بھی بہت اچھی کرتے تھے۔ عوامی نبض پر ابا کی گرفت کو دیکھتے ہوئے ہمارے ہی ضلع کے ایک سابق راجہ دواکر وکرم سنگھ عرف بچہ صاحب نے ابا سے اپنے حق میں پرچار کرنے کی درخواست کی۔ وہ اسمبلی الیکشن میں کسی غیر کانگریسی پارٹی کے امیدوار تھے۔ وہ نہایت شریف اور ایماندار آدمی تھے۔ ان کی شرافت، ایمانداری اور خدمت خلق کے جذبے کے تحت ابا نے ان کے حق میں انتخابی مہم چلائی۔ وہ کامیاب ہوئے اور کچھ عوامی کام بھی انھوں نے کیے۔

ابا سے ان کے بڑے اچھے مراسم قائم ہو گئے۔ ابا کسی کو بھی کسی کام سے ان کے پاس بھیجتے تو وہ ضرور کرتے۔ لیکن دو بار کامیاب ہونے کے بعد ان میں تبدیلی آنے لگی۔ دوسری یا تیسری بار وہ اتر پردیش حکومت میں وزیر بھی بنے۔ لیکن اب عوامی خدمت کا ان کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ ان کو یہ غرور ہو گیا کہ وہ اب تو وزیر رہ چکے ہیں اب انھیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ ادھر عوام میں ان کی ساکھ خراب ہو گئی۔ انھیں پھر ابا کی یاد آئی۔ ابا گاؤں کے مدرسہ پر تھے۔ وہ آئے

اور ابا سے اپنے حق میں انتخابی مہم چلانے کی فرمائش کی۔ ابا ان سے ناراض تھے۔ انھوں نے ان سے بات کرنا گوارہ نہیں کیا۔ لیکن جب وہ بار بار ابا سے اپنے حق میں مہم چلانے پر زور ڈالتے رہے تو ابا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

پھر تو حق گوئی اور سرعام ٹوک دینے کی ان کی رگ پھڑک اٹھی۔ اس وقت وہاں مدرسہ کے صحن میں سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ ابا نے ان کو پھٹکارنا شروع کیا۔ وہ آخر میں یہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر گھر چلے گئے کہ "میں نے تو راجپوت سمجھ کر تمھاری حمایت کی تھی مجھے کیا پتہ تھا کہ تم راجپوت نہیں ہجڑے ہو"۔

دواکر وکرم سنگھ عرف بچہ صاحب نے برا نہیں مانا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے رہے۔ ابا جب اٹھ کر جانے لگے تو انھوں نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر ابا نہیں رکے۔ وہ گھر چلے گئے۔ پھر انھوں نے باری باری کئی لوگوں کو بھیجا کہ مولانا کو بلا لاؤ مگر ابا کو دوبارہ وہاں جانا تھا نہ گئے۔ وہ مغرب کے وقت تک مدرسہ کے صحن میں بیٹھ کر ابا کا انتظار کرتے رہے اور پھر مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ اس الیکشن میں ان کی شکست فاش ہوئی تھی۔

انہی دنوں ایک اسمبلی الیکشن کے دوران ہمارے گاؤں کے اس وقت کے پردھان سوریہ پرکاش مشرا، جو کہ ابا کی وجہ سے پردھان بنے تھے لہٰذا ابا کا بہت احترام کرتے اور انھیں گروجی کہتے، پرماتما سنگھ کو، جو کہ کانگریس کے امیدوار تھے، لے کر ابا کے پاس آئے۔ انھوں نے ابا سے گزارش کی کہ وہ ان کی حمایت کر دیں۔ ابا کانگریس سے ناراض تھے۔ انکار کر دیا۔ پرماتما سنگھ نے ابا سے کہا:

"میں ویر بہادر سنگھ کا داماد ہوں۔ وہ ریاست اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ہونے والے ہیں۔ آپ ہماری حمایت کر دیجیے ہم آپ کے ایک بیٹے کو ابھی سرکاری ملازمت دلوا دیتے ہیں اور دوسرے کو الیکشن کے بعد۔ آپ بینک اور ریلوے دونوں میں سے جس محکمہ میں کہیں ہم ملازمت دلوا دیں گے"۔ (اس کے بعد ہی ویر بہادر سنگھ وزیر اعلیٰ ہو گئے تھے)۔

ابا نے کہا کہ اب تو میں اور بھی آپ کی حمایت نہیں کر سکتا۔ پردھان ابا کو وہاں سے اٹھا کر گھر کے برابر والی تنگ سی گلی میں لے گئے۔ وہاں ان تینوں میں کیا باتیں ہوئیں یہ آج تک راز

ہے۔ لیکن پھر بھی ابا نہیں پسیجے۔ الیکشن میں پرماتما سنگھ ہار گئے۔ بعد میں انھوں نے کسی شخص سے گفتگو کے دوران اپنے اندر کا غبار نکال ہی دیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ میں کیوں ہارا۔ پوچھا گیا کیوں تو انھوں نے کہا کہ ''ایک برہمن نے ایک مسلمنڈے کا پاؤں پکڑ لیا تھا''۔

ایک بار میں کالج سے شام کے وقت واپس آیا اور کسی کام سے بذریعہ سائیکل گاؤں کے مدرسہ پر گیا۔ مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ ابا مصلے پر تھے اور مقتدی اپنی صفوں میں بیٹھے تھے۔ میں نے جاتے ہی سلام کیا اور یہ کہتے ہوئے وہیں کھڑا ہو گیا کہ ابا آپ کب آئے؟ اتنا سننا تھا کہ دھماکہ ہو گیا۔ لگے مجھے زور زور سے ڈانٹنے۔ مقتدی چپ اور حواس باختہ۔ کہنے لگے بس سلام ہو گیا۔ تمھیں معلوم نہیں کہ بغیر مصافحہ کے سلام نامکمل رہتا ہے۔ کم از کم دس منٹ تک ڈانٹنے کا سلسلہ جاری رہا۔ آئندہ جمعہ کے روز جب مسجد میں خطبہ دیا تو اسلام میں سلام کی اہمیت پر دیا۔ وہ ''افش السلام'' یعنی سلام پھیلاؤ والی حدیث پر کافی دیر تک بولتے رہے۔ ان کا یہ وطیرہ تھا کہ کوئی بھی برائی گھر سے ختم کرنے کا آغاز کرتے۔

ابا کی خواہش تھی کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ وہ یوں تو مدرسہ میں پڑھاتے تھے لیکن ہم لوگوں کو ہمیشہ تلقین کیا کرتے تھے کہ انگریزی میں اچھی استعداد پیدا کرو، جتنی اچھی انگریزی ہوگی اتنی ہی تم لوگ ترقی کرو گے۔

۱۹۷۳ء یا ۷۴ء میں حماد بھائی گورکھپور سے بی ایس سی کر رہے تھے میں انٹر کر رہا تھا۔ بعد میں انھوں نے وہاں سے ایل ایل بی کیا۔ اس وقت پتہ نہیں کس بات پر خوش ہو کر نیپال سے گھر آتے ہوئے ابا نے ہم دونوں کے لیے پینٹ کا کپڑا خریدا۔ ہم لوگوں کو یاد نہیں کہ اس کے علاوہ بھی کبھی انھوں نے کپڑے خرید کر دیے ہوں۔ یہ سب کام اماں ہی کرتی تھیں۔ ان دنوں امیتابھ بچن کے بیل باٹم پینٹ کا کریز تھا جس کی مہری ۳۶۔۳۸ انچ ہوتی تھی۔ ہم دونوں نے ڈرتے ڈرتے اٹھارہ یا بیس انچی مہری کی پینٹ سلوائی۔ جب ابا نے دیکھا تو بری طرح برافروختہ ہو گئے۔ کہنے لگے:

''اگر میں جانتا کہ تم لوگ پینٹ نہیں غرارہ سلواؤ گے تو میں کبھی کپڑا خرید کر نہیں دیتا''۔

کس میں ہمت تھی جو پوچھتا کہ اگر یہ غرارہ ہے تو بیل باٹم کو آپ کیا کہیں گے۔

ان دنوں دہلی سے جرائم کے موضوع پر کئی جریدے شائع ہوتے تھے۔ اسی درمیان ایک اور جریدہ نکلا جس کی تحریر کی حدیں فحش نگاری کی سرحدوں کو چھو رہی تھیں۔ اس کا پہلا شمارہ ہم لوگوں نے خریدا اور جستہ جستہ دیکھ کر کمرے میں میز پر رکھ دیا تھا۔ اتفاق سے کافی دیر تک ہم لوگ اس کمرے میں نہیں گئے۔ جب کئی گھنٹے کے بعد گئے تو اس پر ابا کی ایک تحریر دیکھی۔ انھوں نے لکھا تھا: ''یہ ایک فحش اور مخرب اخلاق رسالہ ہے۔ اس کا خریدنا، پڑھنا اور رکھنا سب گناہ ہے۔ جو اسے پڑھے گا وہ جہنم میں جائے گا۔ راقم ایک مسلمان''۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے اس جریدے کو نہ کبھی خریدا نہ ہی کبھی پڑھنے کی جرأت کی۔

وہ کبھی کبھار بہت عجیب وغریب قسم کی حرکتیں کرتے۔ جہاں ایک طرف اپنی خودداری اور بانکپن کو سنبھال کر رکھتے اور ان پر آنچ نہیں آنے دیتے اور اپنے فقر پر فخر کرتے وہیں بعض اوقات افلاس وتنگ دستی کو چھپانے کی بھی ناکام کوشش کرتے۔ پہلے ہمارا گھر کھپریل کا تھا۔ آگے کافی زمین خالی تھی۔ بعد میں ابا نے کسی طرح انتظام کر کے قسطوں میں دو کمرے شمال اور جنوب کی جانب بنوائے اور ان پر لنٹر ڈالا۔ بیچ کے حصے پر چھپر ڈالنا پڑا۔ اسی چھپر میں بڑے بڑے نیتاؤں سے ملاقات کرتے اور بڑے بڑے سماجی و مذہبی مسائل حل کرتے۔

ایک بار ہمارے چھوٹے بھائی قمر جمال کا رشتہ ایک جگہ سے آیا۔ لڑکی والوں نے گھر آنے کا وعدہ کیا۔ جس دن ان لوگوں کو آنا تھا صبح ہی یعنی آٹھ نو بجے کھانا وغیرہ بن کر تیار تھا۔ لیکن ابا کو اس کی فکر ستا رہی تھی کہ اس چھپر کو مہمانوں سے کیسے چھپائیں۔ اس کا انتظام انھوں نے اس طرح کیا کہ چھپر پر اوپر سے چادر اور کتھری ڈال دی۔ ہوا سے جب بھی وہ ادھر ادھر ہوتی تو اسے جا کر درست کرتے۔ حالانکہ سامنے کا حصہ تو چھپ گیا تھا لیکن پیچھے کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس نفسیات کے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔

معروف مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے طویل القامت طنز و مزاح نگار کنھیا لال کپور کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ فلاں صاحب کے گھر چار فٹ کی چارپائی پر آرام سے سو جاتے اور جب اپنے قد کا احساس ہوتا تو لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے گزرتے وقت سر کو جھکا لیتے کہ کہیں ٹکر نہ ہو جائے۔ کچھ اسی قسم کی نفسیات میں نے ابا کے اندر بھی دیکھی۔

بہر حال ہوا یوں کہ دن بھر انتظار کرنے کے باوجود مہمان نہیں آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی نے بھانجی ماردی۔

وہ انتہائی خوددار اور غیرت مند تھے۔ خاندانی وقار اور عزت نفس کو بہت عزیز رکھتے۔ لوگوں میں بھی ان کا بڑا وقار تھا۔ ایک بار سانتھا بازار میں کسی بات پر کسی شخص سے کچھ تلخ کلامی ہوگئی۔ اس شخص نے یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے ان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ پھر کیا تھا۔ طوفان آگیا۔ لیکن یہ طوفان باہر نہیں ان کے اندر آیا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک بھی ہوسکتا ہے۔ چونکہ یہ واقعہ سر بازار پیش آیا تھا اس لیے شام تک بات پھیل گئی۔ ابا کی عجیب کیفیت تھی۔ ایسا لگتا جیسا وہ بولنا بھول گئے ہوں۔

رات میں دس گیارہ بجے دس پندرہ مسلح افراد ہمارے گھر پر آدھمکے۔ سب بہت غصے اور اشتعال میں تھے۔ انھوں نے ابا کو آواز دی۔ وہ باہر آئے۔ ان لوگوں میں کچھ مسلم تو بیشتر غیر مسلم تھے۔ انھوں نے ابا کو سلام اور نمستے کیا۔ کرسیاں منگائی گئیں۔ وہ لوگ ابا کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ لگ رہا تھا کہ وہ جانے کیا کرنے والے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نے جو بظاہر ان کا قائد لگ رہا تھا، ابا سے کہا: ''مولانا کیا ہوا ہے''۔

''نہیں کچھ نہیں ہوا ہے، کوئی بات نہیں ہے''۔

''نہیں نہیں بتائیے کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ کس نے بدتمیزی کی ہے''۔

''چھوڑیے جانے دیجیے، کیا کریں گے جان کر''۔

''مولانا ہم لوگوں کو سب معلوم ہوگیا ہے مگر ہم آپ کی زبانی سننا چاہتے ہیں''۔

''بھائی آپ لوگوں کا شکریہ! مگر کیا کریں گے جان کر چھوڑیے اس معاملے کو''۔ ابا نے بہت سکون کے ساتھ کہا۔

''نہیں مولانا بس آپ اس شخص کا نام بتادیجیے''۔ اس نے غصے سے کہا۔ ابا خاموش رہے۔

''جو ہاتھ آپ کے گریبان تک پہنچے تھے وہ صبح آپ کے قدموں میں پڑے ہوئے ملیں گے، بس آپ صرف اتنا کیجیے کہ اس شخص کا نام بتادیجیے''۔ اس شخص کا اشتعال بڑھتا جارہا تھا۔

''مولانا صاحب ہم اس آدمی کا ہاتھ آپ کے قدموں میں پڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں''۔

ابا پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اس علاقے کے خطرناک لوگ ہیں، جرائم سے ان کا روز کا واسطہ ہے۔ اگر میں نے نام بتا دیا تو یہ اس شخص کے ہاتھ کاٹنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کریں گے۔ وہ اپنی بات پر اٹل رہے۔ ان لوگوں کے لاکھ زور دینے پر بھی ابا نے نام نہیں بتایا۔ وہ یہی سوچتے رہے کہ ابھی تو ان کے اندر ایک طوفان آیا ہوا ہے۔ اگر کچھ ہو گیا تو پورے علاقے میں طوفان آجائے گا۔

بہر حال انھوں نے کسی طرح اس طوفان کو ٹھنڈا کیا۔ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ ورنہ اگر ان لوگوں کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ مولانا کے ساتھ فلاں آدمی نے بدتمیزی کی ہے تو کہرام مچ جاتا۔ دراصل ان میں سے کئی سرکردہ لوگ بالخصوص غیر مسلم ابا کے عقیدت مند تھے اور ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

وہ ایک مقرر اور خطیب کے ساتھ ساتھ ایک مناظر بھی تھے۔ آریہ سماجیوں اور دوسروں سے انھوں نے کئی مناظرے کیے تھے اور کامیاب و کامران لوٹے تھے۔ بنارس کے قریب بجرڈیہا کے مناظرہ کی تاریخ کے اوراق پر ابا کی کامیابیوں کے نقوش ثبت ہیں۔

آپ اپنی خطابت کے دوران اتنے برجستہ اشعار پڑھتے کہ بس مزا آجاتا۔ توحید کے موضوع پر خطاب کے دوران وہ یہ اشعار ضرور پڑھتے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے تھا

فیض ان سرمایہ داروں کی رعونت دیکھ کر
کون کہتا ہے کہ بندوں میں خدا ہوتے نہیں

سیرت پر تقریر کرتے تو یہ شعر پڑھ کر محفل کو گرما دیتے:

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

مختار مسعود نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بارے میں لکھا ہے "ان کے

لیے سیاست دراصل ایک اسٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتظمین جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اردو تقریر تھی۔ اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہمعصر تو بہت تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا"۔ ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم عطاء اللہ شاہ بخاری تو نہیں تھے مگر یہ جملہ بہت حد تک ان پر صادق آتا ہے۔

آپ ایک اسلامی شاعر بھی تھے اور ترنم سے حمد اور بالخصوص نعت بھی پڑھتے۔ آپ بہت خوش الحان تھے اور مترنم آواز میں نعت پڑھنے کا انداز لاثانی تھا۔ بھاری بھرکم مگر انتہائی میٹھی آواز اور مردانہ آہنگ کے ساتھ جب نعت پڑھتے تو پورا مجمع جھوم اٹھتا۔ حب رسولؐ میں ڈوبی ہوئی ان کی نعتیں سامعین پر عجیب وغریب کیفیت طاری کر دیتیں اور لوگ ان کی آواز وانداز کے سحر میں ڈوب جاتے۔ آپ کی نعتیں ایسے اشعار سے پوری طرح پاک ہیں جن میں غلو کر کے اللہ کے رسول کا درجہ بڑھا دیا جاتا ہے اور اشعار سے شرک کی بو آنے لگتی ہے۔ آپ فلمی گانوں کی دھن پر نعت پڑھنے کے سخت خلاف تھے اور اگر کسی مذہبی جلسے میں کوئی شخص فلمی طرز پر نعت پڑھتا تو اسے سختی سے روک دیتے کہ یہ رسولؐ خدا کی شان میں گستاخی ہے۔ نعت پڑھنے کا آپ کا انداز اتنا مقبول ہوا کہ بہت سے انجم ثانی پیدا ہو گئے جو صرف انہی کی نعت اور خالص انہی کے انداز میں پڑھتے اور اپنے نام کے ساتھ انجمی کی نسبت لگاتے۔ آپ کی شاعری خالص اسلامی شاعری ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں آپ نے نعتیں کہی ہیں اور متعدد نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے اسلامی نظمیں بھی بڑی تعداد میں کہی ہیں اور بچوں کی نظموں کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے، جو صرف اور صرف اسلامی رنگ و آہنگ میں ہیں۔

آپ ایک صحافی بھی تھے۔ پہلے مولانا آزاد کے پرچے کے نام پر "الہلال" نامی رسالہ جاری کیا اس کے بعد "المؤتمر" اور "خبر نامہ" کے نام سے جو سالوں نکلنے کے بعد بند ہوتے گئے۔

آپ ایک کامیاب ناظم یا اناؤنسر بھی تھے۔ بڑے جلسوں میں آپ نظامت بھی کرتے اور نظامت بھی ایسی کہ کرسی خطابت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے ہی حاضرین وسامعین پر مقرر کی دھاک بیٹھ جاتی۔ گویا مقرر یا خطیب کی کامیابی میں آپ کی نظامت کا بھی ہاتھ ہوتا۔ آپ کو مشاعروں سے بھی رغبت رہی ہے۔ مگر نعتیہ مشاعروں سے زیادہ شغف رہا۔

ابا کے گیارہ شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں بیشتر نعتیہ اور اسلامی نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ ''چراغ حرم'' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا جو بے حد مقبول ہوا اور انتہائی قلیل مدت میں نایاب ہو گیا۔ مقامی شعرا اس کی نقالی کرنے لگے اور جب ایک نوآموز شاعر نے اسی نام سے اپنا نعتیہ مجموعہ شائع کیا تو آپ نے اپنے مجموعہ کا نام بدل کر ''شمع حرم'' رکھ دیا اور اس کی اشاعت ۱۹۸۶ء میں عمل میں آئی۔ اس مجموعہ کے پیش لفظ کے شروع میں انھوں نے یہ شعر درج کیا کہ ''اعلان کر دو آج سر بزم خاص و عام، شمع حرم ہے اب یہ چراغ حرم نہیں''۔ وہ بھی کچھ دنوں میں نایاب ہو گیا اور ''چراغ حرم'' کی مانگ برابر جاری رہی۔ بعد میں ''چراغ حرم'' ہی کے نام سے اس کا تیسرا ایڈیشن فروری ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بھی اس کی مانگ مسلسل جاری ہے۔

ابا مزاج کے خلاف کوئی بات پہلے پسند کرتے تھے نہ آخری دنوں میں۔ انتقال سے تقریباً ایک سال قبل جب وہ دہلی ہمارے گھر آئے تو پندرہ دن گزارنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ وہ بمشکل پندرہ دن رہے اور وہ بھی جیسے جیل کاٹ رہے ہوں۔ کہاں گھر میں نکلنے والے نہیں۔ ہمیشہ سڑک اور بازار کا چکر لگاتے اور کہاں دہلی میں چوبیس گھنٹے کی قید۔ ان کی ذہنی کیفیت کی وجہ سے ہی ان کو باہر نہیں نکلنے دیا جاتا کہ پتہ نہیں کدھر چلے جائیں۔ تقریباً روزانہ شام کے وقت میں یا کوئی اور ان کو آس پاس ٹہلانے لے جاتا۔ ایک روز مغرب سے کچھ پہلے میں ان کو ٹہلا کر گھر لایا تو پھر میرے بھتیجے شکیب ارسلان سے باہر جانے کا تقاضا کرنے لگے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ ابھی تو گھوم کر آئے ہیں پھر کہاں جائیں گے۔ مشکل یہ تھی کہ دس پندرہ منٹ میں بری طرح تھک جاتے اور اسی درمیان پیشاب بھی خطا ہو جاتا۔

بہر حال ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں ہماری بھانجی شمامہ جو اس وقت یہاں آئی ہوئی تھی روم میں آئی۔ اسے دیکھتے ہی پوچھ بیٹھے: ''یہ لڑکی کون ہے''۔

بچوں نے کہا کہ آپ اس کو نہیں جانتے۔ اور ہنس کر دو تین بار پوچھ لیا۔ پھر کیا تھا مزاج بگڑ گیا۔ مگر خاموش رہے۔ اتنی دیر میں مولانا تجمل حسین ندوی جو کہ ہمارے چچا لگتے ہیں اور دہلی میں قطر ایمبیسی میں ملازمت کرتے ہیں، ملنے آگئے۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ابا کا پارہ چڑھا ہوا

تھا مگر ہم لوگوں کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا۔ میں نے یوں ہی پوچھ لیا: ’’ابا ان کو پہچان رہے ہیں نا‘‘۔
بس کیا تھا جیسے دھما کہ ہو گیا۔ انتہائی غصے کے عالم میں اور تیز آواز میں بولے:
’’کون نہیں جانتا ان کو، ہیں؟ کون نہیں جانتا‘‘۔
ہم لوگ لرز کر رہ گئے۔ پھر جانے کیا کیا بولتے رہے۔ ہم لوگ سمجھ نہیں پائے کہ آخر ہوا کیا ہے۔ اتنے میں مفتی جمیل احمد صاحب بھی آ گئے۔ ان سے محبت سے ملے۔ مگر بہکی بہکی باتیں کرتے رہے۔ مفتی صاحب بھی پریشان کہ کیا ہو گیا ہے مولانا کو۔ مغرب کے ایک آدھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں چلے گئے۔ ابا کا موڈ اب بھی خراب۔ بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بات سے ان کو بہت زیادہ تکلیف پہنچی ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان کو کس بات سے تکلیف پہنچی ہوگی کہ انھوں نے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر کرتے ہوئے دھیرے سے کہا:
’’آج تک مجھے کسی بات سے ایسی تکلیف نہیں پہنچی تھی جیسی آج پہنچی ہے‘‘۔
’’ابا کس بات سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے‘‘۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا:
’’کیا بچوں نے کچھ کہا ہے‘‘۔ کچھ نہیں بولے، خاموش رہے۔ آنکھیں نمناک تھیں۔
’’اگر بچوں نے کچھ کہا ہے تو وہ ابھی آپ سے معافی مانگیں گے‘‘۔ اتنا کہہ کر میں نے تمام بچوں کو آواز دی۔ وہ آئے تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں میں سے کسی نے دادا کو کچھ کہا ہے۔ ’’نہیں تو کسی نے کچھ نہیں کہا ہے‘‘۔
’’نہیں آپ لوگوں نے ضرور کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے آپ کے دادا کو تکلیف پہنچی ہے۔ آپ لوگ فوراً معافی مانگیے‘‘۔
میرے اتنا کہتے ہی سب لائن لگا کے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ ’’دادا! اگر ہم لوگوں سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کیجیے‘‘۔
بہر حال دو تین بار معافی مانگ کر بچے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ابا خاموش تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایسا لگا جیسے ان کی کیفیت یکسر تبدیل ہو گئی ہو۔ آبدیدہ ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مجھ سے کہنے لگے:

"بابو مجھے معاف کرنا میں نے تم لوگوں کو بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ دیکھو کیسے سارے بچے آکر معافی مانگ رہے ہیں۔ بیچارے بچے"۔

"نہیں ابا آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔ ہم لوگوں کو ڈانٹنے اور مارنے کا آپ کا حق ہے۔ آپ کی ڈانٹ اور مار ہم لوگوں کے لیے دعا سے کم نہیں"۔

کافی دیر تک رنجیدہ رہے اور بار بار یہی کہتے رہے کہ میں نے آپ لوگوں کو بہت تکلیف پہنچائی مجھ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا، بچے کیسے معافی مانگ رہے تھے۔ پھر بہت دیر تک ہم تمام لوگوں کو رقت آمیزی کے ساتھ دعائیں دیتے رہے۔

آج وہ نہیں ہیں تو یہ اور ایسے نہ جانے کتنے واقعات ذہن کے پردے پر فلم کی مانند چل رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہم لوگوں کو دعاؤں سے نوازتے رہے ہیں۔ محبت تو وہ سب سے کرتے رہے ہیں۔ ہماری بھابھی نے پانچ سال قبل ہماری اماں کے انتقال کے بعد جس طرح ان کی خدمت کی اور ان کی ایک ایک بات کا خیال رکھا اس کا بھی اعتراف کرتے۔ آج ہم لوگ خود کو کتنے تہی دست، تنہا اور بے یارومددگار محسوس کررہے ہیں۔ وہ زندگی بھر ہم لوگوں کو دعائیں دیتے رہے۔ مگر آج وہ ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کی لغزشیں معاف کرے اور ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے اور ان کو جنت الفردوس میں مقام عطا کرے۔

(آمین)

☆☆

نواب بخش

(صبر و شکر کی مورت)

اوسط قد، دبلا بدن، ٹھڈی داڑھی، لمبا چہرہ، چہرے پر مسکینیت، سانولا رنگ جسے مفلسی کی کڑی دھوپ نے اور سنولا دیا تھا، کرتا لنگی میں ملبوس، ذرا سی کمر جھکی ہوئی، بہت کم گو اور بہت زیادہ صابر و شاکر۔ یہ تھے ہمارے چھوٹے دادا جنھیں ہم لوگ بابا کہتے تھے۔ ہم لوگوں نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا۔ یہی ہمارے دادا بھی تھے اور چھوٹے دادا بھی۔

دادا اور بابا میں کچھ شباہتیں تھیں تو بہت سے تضادات تھے۔ دادا کے ایک بیٹا تھے یعنی ہمارے والد۔ بابا کی ایک بیٹی تھیں یعنی ہماری پھوپھی جنھیں ہم لوگ بوا کہتے تھے۔ ہمارے والد کی عمر ڈھائی تین سال رہی ہوگی کہ ان کی والدہ یعنی ہماری دادی ان کے سر سے اپنا سایۂ شفقت اور دستِ محبت سمیٹ کر دوسری دنیا میں کوچ کر گئیں۔ ہماری چھوٹی دادی نے ان کی تقلید کی اور بابا کی گود میں ایک بیٹی ڈال کر وہ بھی پیچھے پیچھے چلتی بنیں۔ ہمارے دادا اپنی اہلیہ یعنی ہماری دادی کی جدائی کا غم زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکے اور اپنے بیٹے کے لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی یعنی ان کے تیرہ سال تک پہنچتے پہنچتے دنیا سے سدھار گئے۔ لیکن بابا بڑے صابر و شاکر نکلے۔ انھوں نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں دنیا کو خیر باد کہا۔ ہاں ہماری بوا یعنی ان کی بیٹی کو اپنی ماں کی یاد ستاتی رہی اور انھوں نے ایک بیٹے اور تین بیٹیوں کو دنیا میں لا کر دنیا سے منہ موڑ لیا۔ بابا نے اپنی بیٹی اور بھتیجے کی موہ میں کہ ان کا کیا ہوگا، انھیں کون سنبھالے گا، دوسری شادی نہیں کی۔

انھوں نے ہمارے والد کی پرورش بھی اسی طرح سے کی جس طرح اپنی بیٹی کی کی۔ بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ بھتیجے کو بیٹی سے زیادہ چاہتے تھے۔ ان کی اور گاؤں والوں کی کوششوں اور دلچسپیوں سے ابا نے اچھی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مدرسہ ریاض العلوم جامع مسجد دہلی سے فراغت حاصل کی اور طبیہ کالج قرول باغ سے حکمت کی ڈگری لی۔

ہمارے ابا کی شادی ہمارے گھر کی پشت کی جانب دو مکان چھوڑ کر حاجی شاہ محمد عرف حاجی شاہو کی صاحبزادی سہیمہ خاتون سے ہوئی اور بوا کی شادی ہمارے مکان کے پانچ مکان جنوب میں اسی محلے میں چودھری کے بیٹے محمد یٰسین سے ہوئی۔ ہمارے دادا اس علاقے کے تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ان کا نام جان محمد انصاری تھا اور علاقے کے لوگ ان کو میاں صاحب کہتے تھے۔ وہ گاؤں کے بچوں کو اپنے گھر پر قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم دیتے تھے۔ اس وقت تک ہمارے گاؤں میں جو کہ نیا نیا آباد ہوا تھا کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ مدرسے کی بنیاد ہمارے والد نے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں رکھی۔ ہماری اماں بتاتی تھیں کہ دادا بہت شریف اور ایماندار شخص تھے۔ غربت گھر کی شان تھی۔ تنگ دستی سے یارانہ تھا۔ وہ تعلیم یافتہ بزرگ، دیندار، عبادت گزار تھے۔ صوم و صلاۃ کے پابند، قرآن و حدیث پر عامل، گورے چٹے کابلی پٹھان کی سی قد کاٹھی کے مالک اور تعلیم و تعلم سے وابستہ منکسرالمزاج شخصیت کے مالک۔

وہ ایک فنکار بھی تھے۔ وہ رضائی کے کپڑے پر چھپائی کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ خود پھولوں کے ڈیزائن والے لکڑی کے بلاک بناتے جنھیں ''ٹھپہ'' کہا جاتا تھا۔ خود ہی رنگ تیار کرتے اور اس میں ٹھپے کو ڈبو کر چھپائی کرتے۔ میں نے اپنے بچپن میں درجنوں ٹھپے دیکھے تھے جو ایک کمرے کے کونے میں پڑے رہتے تھے۔ وہ کم از کم دو تین انچ چوڑے اور چار پانچ انچ لمبے ہوتے تھے اور پشت پر پکڑنے کے لیے ایک مُٹھیا ہوتی جو اسی لکڑی کو کاٹ کر بنائی ہوئی ہوتی۔ ڈیزائن سامنے کی جانب کندہ ہوتا۔ مگر غربت کی آگ نے ایک ایک کر کے تمام ٹھپوں کو چولہے کی نذر کر دیا۔

دادا کو شاعری کا بھی بڑا شوق تھا۔ ان کو بہار کے ایک مذہبی شاعر مولانا محمد مسلم کا ''دیوان گلشن'' پورا ازبر تھا۔ وہ کاتب نہیں تھے مگر انھوں نے خود ہی روشنائی بنائی، نرکٹ کا قلم بنایا

اور بغیر لائنوں والے کاغذ پر پورے دیوان کی کتابت کر دی۔ اس کی جلد بندی بھی انھوں نے خود ہی کی تھی۔ میں نے پندرہ بیس سال کی عمر تک اس مخطوطے کو اپنے گھر میں دیکھا تھا مگر اس کے بعد پرانے گھر کو توڑ کر نئے گھر کی تعمیر کے نتیجے میں وہ مخطوطہ ضائع ہو گیا۔ اسے کون لے گیا کچھ پتہ نہیں۔ اس بات کا ہم لوگوں کو بڑا قلق ہے۔ صرف وہی نہیں بلکہ چار پانچ بڑے بڑے بکسوں میں رکھی ابا کی نادر و نایاب کتابیں بھی، جن کو وہ اماں کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتے، خدا جانے کہاں چلی گئیں۔ ان بکسوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال کے شمارے، مولانا عامر عثمانی کے ماہنامہ رسالہ تجلی کے شمارے، ماہر القادری کے رسالہ فاران، ماہنامہ بیسویں صدی، شمع، ہدیٰ، ہما اور ان جیسے دیگر رسالوں، ڈائجسٹوں کے شماروں اور مذہبی کتابوں کا ذخیرہ تھا مگر وہ کہاں لاپتہ ہو گیا کچھ نہیں معلوم۔

دادا حافظ تو نہیں تھے مگر ان کو قرآن کی بہت ساری صورتیں یاد تھیں۔ ہماری اماں کے مطابق جب وہ مرض الموت میں تھے تو اماں اور بہت سی لڑکیاں ان کی چارپائی کے قریب بیٹھ کر تلاوت کر رہی تھیں۔ ایک جگہ اماں سے غلطی ہوئی تو مرض الموت کی تکلیف کے باوجود انھوں نے فوراً ٹوک دیا۔ اس وقت اماں کی عمر یہی کوئی آٹھ دس سال رہی ہو گی۔

ہمارے نانا اور نانی اور دوسرے افراد ابا کو بہت مانتے تھے۔ نانی جو کہ اس وقت تک ابا کی ساس نہیں بنی تھیں ابا کا بڑا خیال رکھتیں۔ وہ بھی نیک خاتون تھیں۔ پنج وقتہ نمازی اور انتہائی شریف اور محبت کرنے والی خاتون۔ انھوں نے اپنی پانچ میں سے دوسری بیٹی کی شادی ہمارے والد سے کی تھی۔ عمر کے آخری لمحوں تک وہ ہم لوگوں سے بے انتہا محبت کرتی رہیں۔

ہماری اماں زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ پہلے ہمارے دادا نے انھیں قرآن مجید پڑھایا اور پھر محلے کے ایک اور بزرگ شبراتی بابا نے قرآن اور اردو پڑھائی۔ انھوں نے دوسرے بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی اردو عربی کی ابتدائی تعلیم دی تھی۔ حالانکہ وہ بھی زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ بچوں کو پڑھانے کی وجہ سے ہی لوگ انھیں استاد چچا اور استاد بابا کہا کرتے تھے۔ ہماری اماں نے اپنے مطالعے سے اتنا مذہبی علم حاصل کر لیا تھا کہ گاؤں میں کسی عالم کی غیر موجودگی میں اگر کوئی دینی مسئلہ پیدا ہوتا تو لوگ انہی سے رجوع کرتے۔ ابا نے ایک مردہ سنت کو زندہ کرنے

کے لیے عیدین کی نماز میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی لے جانے کی روایت شروع کی تھی۔ اگر کبھی بارش کے دنوں میں ایک ساتھ مردوں اور عورتوں کے عید کی نماز کی ادائیگی میں دشواری ہوتی تو مرد حضرات گاؤں کی بڑی مسجد میں، جس میں نماز جمعہ ہوتی ہے، نماز دوگانہ ادا کرتے اور عورتیں چھوٹی مسجد میں۔ ہماری اماں ہی عورتوں کی عید کی نماز کی امامت کرتیں اور خطبہ دیتیں۔

ہمارے بابا ان پڑھ تھے۔ ان کے داماد یعنی محمد یٰسین بھی ان پڑھ ہیں۔ ان کے بیٹے یعنی ہم لوگوں کے پھوپھازاد بھائی محمد اسلم کی بھی واجبی سی تعلیم ہوئی۔ بابا کا نام نواب بخش تھا اور انھیں لوگ نبو بابو کہہ کر پکارتے۔ ہم لوگوں پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ اگر میں عقیدۂ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہتا کہ سات جنموں میں بھی ہم لوگ ان کا قرض نہیں اتار سکتے۔ دنیا میں آنے کے بعد ہماری آنکھوں نے صرف دو چہرے دیکھے۔ ایک اماں کا اور دوسرا بابا کا۔ ابا تو گھر پر بہت کم رہتے۔ اس لیے آنکھوں میں اماں کے علاوہ اگر کسی اور کی صورت آج تک بسی ہوئی ہے تو وہ بابا کی ہے۔ حالانکہ ان کے انتقال کو کم از کم پچیس تیس سال ہو گئے ہیں۔

بڑے بھائی حماد انجم اور میں ان کو بہت تنگ کیا کرتے۔ یہ جرأت اور شوخی ان کی بے پناہ محبت اور والہانہ لگاؤ نے دی تھی۔ لیکن ہم لوگ جان بوجھ کر تنگ نہیں کرتے۔ بلکہ جانتے تھے کہ ہم جو کچھ بھی کہیں گے بابا مان لیں گے، جو چاہتے کہتے اور جو چاہتے مانگتے۔ اس وقت ہم لوگوں کی عمر دس سال کے اندر ہی رہی ہوگی۔ ان سے ایسی ایسی فرمائشیں کرتے کہ آج سوچتے ہیں تو ہنسی بھی آتی ہے اور بابا کی شرافت اور سادہ لوحی پر ترس بھی آتا ہے۔ یہ آج سے چالیس پچاس سال قبل کی بات ہے۔ اس وقت تک گاؤں میں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں بھی کسی کے گھر پاخانہ نہیں بنا تھا۔ بابا ہم لوگوں کو باری باری اور بعض اوقات ایک ساتھ گاؤں کے باہر رفع حاجت کے لیے لے جاتے۔ یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ برسات کے دنوں میں بھی جبکہ پورا گاؤں پانی اور کیچڑ سے سنا ہوتا اور گاؤں کے مشرق میں واقع اکلوتا باغ پاخانوں سے بھرا ہوتا وہ ہم لوگوں کو یہاں سے وہاں لیے لیے پھرتے۔

بارہا ایسا ہوتا کہ جگہ جگہ پاخانہ دیکھ کر ہم لوگ بیٹھنے سے انکار کر دیتے۔ بابا دھیرے

سے پوچھتے: ''پھر کہاں جھاڑ اُبھر و گے''۔

''ادھر 'نبی سگروا' کی طرف''۔ہم لوگوں کا جواب ہوتا۔

'نبی سگروا' گاؤں کے شمال میں واقع علاقے کے مرکزی بازار کے بعد دوسرے گاؤں کے سرے پر واقع ایک بہت بڑا سا پوکھرا ہے جسے سب لوگ نبی سگروا کہتے ہیں۔اس کے مغرب میں عام راستہ اور پھر کھیت تھے جو آج بھی ہیں۔البتہ اب بازار اور سگروا کے درمیان واقع کھیت انسانی آبادی سے پُر ہو گئے ہیں۔وہاں اس وقت چوڑی چوڑی مینڈیں ہوتیں۔اب تو وہ مینڈیں نیا جنم لے کر سڑک بن گئی ہیں۔وہاں کھیتوں میں کم گندگی ہوتی۔بابا ہم لوگوں کو لے کر باغ سے گاؤں میں آتے، پھر بازار سے ہوتے ہوئے ان کھیتوں میں پہنچتے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم دونوں بابا کے کندھے پر بیٹھنے کی ضد کرتے۔وہ باری باری ایک ایک کو اپنے کندھے پر بٹھاتے۔جب دونوں بہت زیادہ ضد کرتے تو وہ بیچارے ہم دونوں کو ایک ایک کندھے پر بٹھا لیتے۔نہ تو ان کے چہرے پر ناگواری کی پرچھائیں نظر آتی اور نہ ہی پیشانی پر کوئی بل۔ایسا لگتا جیسے ہم دونوں بچے نہیں انگوچھا ہیں جنھیں انھوں نے ایک ایک کندھے پر ڈال لیا ہے۔ہم لوگ ان سے یہ مشق عموماً کرواتے ہی رہتے۔صرف اتنا ہی نہیں کہ صرف ہم ہی دونوں انھیں تنگ کرتے۔بلکہ اس نیک کام میں ان کے نواسے اسلم بھیا بھی شریک ہو جاتے۔

ایک بار بابا حماد بھائی، اسلم بھیا اور ہم لوگوں کو لے کر پوکھرے میں نہانے گئے تھے۔ادھر سے آنے کے لیے بازار کے درمیان سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ادھر ایک محلہ ہے جس میں بیشتر بنیا برادری کے لوگ ہیں۔وہاں مٹھائیوں کی دکان تھی۔ادھارے بابا کی اور شیام لال نانا کی۔شیام لال کی دکان کے سامنے سے جب گزرے تو دیکھا کہ دکان پر کوئی نہیں ہے۔بچپن کی رگِ شرارت پھڑک اٹھی۔اسلم بھیا نے ایک تھال میں رکھے ہوئے پیڑوں میں سے دو چار پیڑے اٹھا لیے اور قمیص کے دامن میں چھپا لیے۔بھیا نے دیکھا تو انھوں نے بھی ایسا ہی کیا۔اسلم بھیا نے دیکھا تو کہا اچھا تم نے زیادہ نکال لیے۔پھر تو مقابلہ شروع ہو گیا۔انھوں نے لپک کر اور زیادہ نکال لیے۔اسلم بھیا نے پھر ان سے بھی زیادہ نکال لیے۔

چونکہ یہ لوگ دوڑتے ہوئے آئے تھے اس لیے بابا پیچھے رہ گئے تھے۔'پیڑا چوری' کی یہ

مشق جاری ہی تھی کہ تب تک بابا وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جب یہ حرکت دیکھی تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ زور سے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ دونوں بھاگ گئے۔

ایک بار بابا انہی دونوں کو 'جھاڑا پھرانے' کے لیے گاؤں کے جنوب کی جانب کھیتوں میں لے گئے تھے۔ واپسی پر جب دونوں الطاف میاں کے گھر کے قریب پہنچے تو ان کے چھوٹے بھائی خیرات میاں کی پالی ہوئی کتیا نے دونوں پر بھونکنا شروع کر دیا۔ حماد بھائی تو جی چھوڑ کر بھاگے۔ اسلم بھیا بھی بھاگے مگر ذرا سست روی سے۔ کچھ دور چلنے کے بعد حماد بھائی کو احساس ہوا کہ اسلم بھیا نہیں آرہے ہیں۔ (اسلم بھیا حماد بھائی سے تقریباً ایک ماہ بڑے ہیں)۔ کتیا کے بھونکنے کی آواز بھی گھٹی گھٹی سی محسوس ہو رہی ہے۔ ادھر جب اسلم بھیا نے دیکھا کہ اب کتیا حملہ کر دے گی تو ان کے ذہن میں فوری طور پر ایک ترکیب سوجھ گئی۔ انھوں نے پائجامے کا ازار بند کھس سے کھینچ کر نکالا اور بڑی جرأت کے ساتھ کتیا کا منہ پکڑ کر فٹافٹ باندھ دیا۔ بھیا نے پلٹ کر دیکھا تو کتیا منہ ہلا ہلا کر کوں کوں کر رہی ہے اور اسلم بھیا پائجامہ ہاتھ میں لیے بھاگے چلے آرہے ہیں۔ اسی اثنا میں بابا بھی وہاں پہنچ گئے۔ خیرات میاں کو بھی اپنی دلاری کتیا کی بدلی ہوئی آواز سنائی دی تو وہ گھر سے باہر آگئے۔ جب انھوں نے یہ منظر دیکھا تو غصے سے لال بھبھوکا ہو گئے۔ لگے برا بھلا کہنے۔ انھوں نے بابا کو دیکھا تو سمجھ گئے یہ ان کے پوتے اور نواسے کی شرارت ہے۔ لگے بابا کو بولنے۔ بابا نے ان سے معذرت کی اور گھر آگئے۔ مگر انھوں نے ان دونوں کو کچھ نہیں کہا۔ ایسے مواقع بارہا آتے کہ ہم لوگوں کی وجہ سے بابا کو شرمندگی اٹھانی پڑتی مگر نہ تو ان کی پیشانی شکن آلود ہوتی اور نہ ہی وہ ہم لوگوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے۔

میری عمر کوئی پانچ چھ سال رہی ہوگی کہ ایک دور کے رشتے دار کے یہاں سے شادی کا نیوتا آیا۔ بابا نے جانے کی تیاری کر لی۔ عین وقت پر میں نے بھی ضد پکڑ لی۔ جس گاؤں میں جانا تھا اس کا نام 'کتھر پوروا' ہے۔ ہمارے گاؤں سے کم از کم پندرہ کلو میٹر دور۔ بابا نے جب ایک معصوم بچے کو مچلتے ہوئے دیکھا تو لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ فجر کے وقت اماں نے اٹھ کر موٹی روٹی پکائی اور بھیلی (گڑ) کے ساتھ ایک انگوچھے میں باندھ کر دے دی کہ راستے میں ناشتہ کر لیں گے۔ فجر کے وقت ہم دونوں بابا پوتا نکل پڑے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہی میں تھک گیا۔

میں نے بابا سے کہا: ''بابا گھورتاں لے لو''۔ یعنی اپنی پیٹھ پر سوار کرا لو۔

بابا کیا کرتے۔ بیٹھ گئے۔ میں ان کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ بابا ننگے پاؤں اور میں بھی ننگے پاؤں۔ میں تو ان پر سوار ہو جاتا مگر وہ بیچارے ننگے پاؤں مجھے لادے لادے چلتے۔ کچھ دور تک چلنے کے بعد وہ مجھے اتار دیتے۔ ایک آدھ کلو میٹر پیدل چلنے کے بعد میں پھر ضد کرتا اور وہ پھر یا تو گھورتاں لاد لیتے یا کندھے پر بٹھا لیتے۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ موسم گرما کے دن تھے۔ ندی پار کر کے جانا پڑتا تھا۔ جب ہم لوگ دن چڑھے ندی کے ساحل پر پہنچے تو بابا پگڈنڈی کے برابر میں جھاڑیوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا: ''بابا کیوں بیٹھ گئے''۔

انھوں نے شفقت آمیز انداز میں کہا: ''ارے کچھ کھا لو کچھ ستا لو''۔

حالانکہ مجھے تو صرف کھانا تھا ستانا تو ان کو تھا۔ تھکن تو ان پر غالب تھی۔ راستے ان سے ان کا حال پوچھ رہے تھے۔ آبلہ پائی ان کی ان سے شکایت کر رہی تھی۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا:

نہ پوچھو کون ہیں کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

دونوں نے زمین پر پالتی مار لی۔ بابا نے انگوچھا کھول کر روٹی بھیلی نکالی۔ دونوں نے جم کر کھایا اور اس ندی کا پانی پیا جو سوکھ کر پایاب ہو گئی تھی۔ اس خود ساختہ دعوت میں 'دعوت شیراز' کا مزا آ گیا۔ میں آج جب اس واقعہ کو سوچتا ہوں تو اس بھیلی روٹی اور ندی کے پانی کا ذائقہ منہ میں محسوس کرتا ہوں۔ شاید اتنا اچھا ذائقہ اب کسی کھانے میں نہیں ملتا۔

ہم دونوں ندی کا پانی پی کر سیراب ہو گئے۔ بابا نے کہا اٹھو چلتے ہیں۔ چلنا انہی کو تھا مجھے تو ان کے کندھے پر سوار ہونا تھا۔ انھوں نے لنگی کا پھانڑ کسا۔ (لنگی کو آگے کی طرف بٹور کر گھٹنوں کے اوپر کر کے پیچھے لے جا کر دھوتی کی طرح کھونس لینے کو پھانڑ کسنا کہتے ہیں)۔ مجھے کندھے پر بٹھایا اور پانی میں اتر گئے۔ بابا کے گھٹنوں کے اوپر تک پانی تھا۔ بہر حال اس پار ہو گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے بابا سے کہا: ''بابا بھوک لگ رہی ہے۔ کیوں اتنی جلد بھوک لگ گئی''۔

انھوں نے کہا: ''روٹی کھا کے ندی کا پانی پیا ہے اس لیے''۔

''کیوں ندی کے پانی سے کیا ہوتا ہے''۔ میں نے سوال کیا۔

"ندی کے پانی سے کھانا بہت جلد ہضم ہو جاتا ہے"۔ انھوں نے پتے کی بات بتائی۔

اس طرح ہم لوگ ظہر کے وقت کھرپوروا پہنچ گئے۔ اگلے روز شادی تھی۔ مگر مہمانوں سے نہ صرف گھر بلکہ محلّہ بھی بھرا ہوا تھا۔ سونف کے شربت سے، جس میں ہلکی سی سرخ مرچ بھی ملی ہوئی تھی ہم لوگوں کی تواضع کی گئی۔ پہلے زمانے میں دیہی علاقوں میں جن لوگوں کے یہاں مفلسی ڈیرہ ڈالے ہوتی وہ شربت میں کچھ مرچ ملا دیتے تاکہ لوگ کم پئیں۔ ہم دونوں نے ایک ایک گلاس پیا اور پھر چارپائی پر بچھی سوزنی پر لیٹ گئے۔

دو روز کے بعد واپسی بھی اسی طرح ہوئی جس طرح روانگی ہوئی تھی۔ میں جب بھی اس واقعہ کو سوچتا ہوں تو جذبات کی شدت سے نمناک ہو جاتا ہوں۔ دل یہ سوال کرنے لگتا ہے کہ کیا اللہ میاں اب بھی ایسے انسان بناتے ہیں۔ کیا انھیں انسان ہی کہنا چاہیے فرشتہ نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ بابا انسان نما فرشتہ تھے۔ کیا شرافت تھی، کیا قناعت تھی، کیا صبر و شکر تھا، کیا خاکساری و انکساری تھی۔ آخر وہ ہم لوگوں کے برتاؤ پر جھلاتے کیوں نہیں تھے۔ برا کیوں نہیں مانتے تھے۔

گرمی کے دنوں میں دُوارے پر رات میں چارپائی بچھا کر جب سونے کی کوشش کرتے تو بابا سے قصے کہانیاں سنتے۔ ان کو زیادہ قصے نہیں آتے تھے اس لیے وہ دو تین قصے بار بار دوہراتے اور ہم لوگوں کو ہر بار ان قصوں میں نیا مزا ملتا۔ ایک قصہ تو سات بھائیوں کی اس اکلوتی بہن کا ہوتا جس کے تمام بھائی کمانے کے لیے بدیس چلے جاتے ہیں اور وہ تنہا جنگل میں روتی اور بھٹکتی رہتی ہے۔ اس کا ٹیپ کا بند تھا "ساتوں بھائی گئے بدیس، آجھل رووے بیچ بن میں"۔ دوسرا قصہ اس دیو کا ہوتا جس کی جان ایک طوطے میں تھی اور تیسرا قصہ اس چوہے کا ہوتا جو لالچ میں آ کر اتنا زیادہ کھا لیتا کہ بل میں گھس نہیں پاتا اور اسے خود کو دبلا کرنے کے لیے بسولے سے اپنی ہپ چھلوانی پڑتی۔ اس قصے میں ٹیپ کا بند تھا "کھائے بنا رہا نہ جائے، پیٹ پھولے جیو جائے"۔

بچے اپنے باپ کے کندھوں پر سوار ہو کر میلوں ٹھیلوں میں جاتے ہیں مگر ہم لوگوں کو بابا نے اپنے کندھے پر سوار کرا کے بزرگوں کی اس روایت کو زندہ رکھا۔ محرم کا جلوس نکل رہا ہو یا ہندوؤں کے تہوار پر لگنے والا کوئی میلہ ہو، ہر بار بابا کے کندھے، ہم لوگوں کی تواضع کے لیے حاضر رہتے۔ گویا ان کندھوں پر اعمال لکھنے والے دو فرشتوں کے علاوہ دو معصوم فرشتے بھی بوجھ بن جایا

کرتے۔ محرم کے جلوسوں اور میلوں میں وہ ہم لوگوں کو خاص طور پر رنگین پنیوں والا چشمہ خرید کر دیتے اور ہم لوگ اسے آنکھوں پر لگا کر خود کو دنیا کے سب سے خوش قسمت بچے بلکہ شہزادے تصور کرتے۔

ہم لوگ جس علاقے کے ہیں وہاں سے یعنی اتر پردیش کے بستی ضلع سے معدودے چند لوگ ہی پاکستان گئے تھے ورنہ سب نے ہندوستان ہی کو اپنا ملک جانا اور مانا۔ ایک بار ہم لوگوں نے بابا سے پوچھا: ''بابا آپ لوگ پاکستان کیوں نہیں گئے''۔

انھوں نے جواب دیا: ''کیا کرتے پاکستان جا کر اور کیسے جاتے۔ ہم لوگوں کے پاس کہاں اتنے پیسے تھے۔ ارے یہیں زندگی گزر جائے یہی بہت ہے''۔

''اچھا بابا یہ بتاؤ کہ اس وقت کیسا ماحول تھا''۔

''ارے بابو بہت خراب ماحول تھا''۔

''کیوں خراب کیوں تھا''۔

''بڑی مارکاٹ تھی۔ یہاں تو نہیں تھی، مگر سنا ہے کہ دوسری جگہوں پر بڑا خون بہا''۔

''اچھا جب پاکستان بن رہا تھا تو لوگ کیا کہتے تھے''۔

''لوگ بہت سے نعرے لگاتے۔ ایک نعرہ یاد ہے جو یہاں کے لوگ اکثر لگایا کرتے''۔

''وہ کون سا نعرہ تھا ذرا بتاؤ بابا''۔

''وہ نعرہ تھا: ہاتھ میں دستی منہ میں پان، چل مورے گوئیاں پاکستان''۔

ہم لوگوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر اس نعرے کو یاد کر لیا اور جب ہم لوگ موج میں ہوتے یا کھیل میں مگن ہوتے تو زور زور سے نعرہ لگاتے ''ہاتھ میں دستی منہ میں پان چل مورے گوئیاں پاکستان''۔

بابا کے مطابق کچھ دنوں کے بعد جب ماحول تھوڑا ٹھنڈا ہوا تو پولیس ایسے لوگوں کی سرگرمی سے تلاش کرنے لگی جن کے بارے میں شبہ ہوتا کہ وہ یہاں سے پاکستان چلے گئے تھے اور پھر چوری چھپے واپس آ گئے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہمارے گاؤں میں پیش آیا۔ فاروق ماما کے گھر جو بعد میں میرے سسر ہوئے، ان کے ایک رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اگر کوئی

رشتے دار آتا تو فوراً چارپائی بچھتی اور اس پر سوزنی اور چادر بچھائی جاتی اور دھو کر مہمانوں کے لیے رکھا رہنے والا تکیہ نکالا جاتا۔ اگر کسی کے گھر اس طرح کوئی چارپائی بچھتی تو لوگ سمجھ جاتے کہ کوئی مہمان آیا ہوا ہے۔ فاروق ماما کے رشتے دار چارپائی پر آرام فرما تھے کہ دھڑ دھڑاتے ہوئے پولیس والے آ گئے۔ انھوں نے ان کو جکڑ لیا۔ اس سے قبل کہ کوئی کچھ سمجھ پاتا پولیس والے ان کو لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے شور مچایا تو محلے کے لوگ اور پھر پورے گاؤں کے لوگ اکٹھا ہو گئے۔

لوگوں نے پولیس والوں سے پوچھا: ''ارے صاحب انھیں کاہے لے جا رہے ہو''۔

''یہ پاکستان سے بھاگ کر آیا ہے، ہم لوگ بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھے''۔ پولیس والوں نے جواب دیا۔

گاؤں والوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لوگ جانتے تھے کہ یہ تو بخشو بابو ہیں، یہ تو کبھی پاکستان گئے ہی نہیں تو بھاگ کر آنے کا کیا سوال ہے۔ لوگوں نے پولیس کے بیان کی تردید کی اور احتجاج کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگ غلط کام کر رہے ہیں۔ یہ تو یہیں کے ہیں پاکستان سے کیسے آئیں گے۔

پولیس والوں نے کہا: ''ہمارے پاس ان کی تصویر ہے اور ہم نے ان کو پکڑنے سے پہلے چھپ چھپ کر تصویر سے ان کا چہرہ ملایا ہے''۔

لوگوں نے کہا: ''لاؤ ذرا ہم لوگ بھی تصویر دیکھیں''۔

گاؤں والوں نے تصویر دیکھی تو ہکا بکا رہ گئے۔ بالکل ان سے ملتی جلتی تصویر تھی۔ تصویر والا شخص بھی ایک آنکھ کا کانا تھا اور یہ بھی ایک آنکھ کے کانے تھے۔ بس کسی کی نظر نے کام کر دیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا: ''ارے صاحب ان کی داہنی آنکھ کانی ہے اور تصویر کی بائیں آنکھ کانی ہے''۔

پولیس والوں نے بھی غور سے دیکھا اور تب ان کی سمجھ میں آیا کہ اگرچہ شباہت میں مماثلت ہے مگر یہ وہ آدمی نہیں جس کی انھیں تلاش ہے۔ پولیس والے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور اس طرح ایک بے قصور شخص دوسری آنکھ کا کانا ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔

بات بابا کی ہو رہی تھی مگر تقسیم ہند کے واقعات کے تسلسل میں کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ بہر حال بابا بہت قناعت پسند تھے۔ حقے کے علاوہ کسی چیز کی عادت نہیں تھی۔ منگل کو

گاؤں میں لگنے والے بازار کے دن اماں اس بات کا خاص خیال رکھتیں کہ حقے کا تمبا کو آیا ہے یا نہیں۔ وہ بھی کبھی کبھار حقہ پی لیتیں۔ کبھی اماں تو کبھی ہم لوگ حقے کی چلم میں آگ بھرتے۔ دو تین دنوں کے بعد اس کا پانی تبدیل کرتے۔ ہمارے دادا بھی حقے کے شوقین تھے۔ سچ پوچھیے تو گاؤں میں حقے کا بڑا چلن تھا۔ پیتل کی ایک بہت بڑی اور وزنی مرادآبادی پھارسی، جس پر بہت خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے، بہت دنوں تک ہمارے گھر میں رہی جو دادا استعمال کیا کرتے تھے۔ بابا نے اس کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ وہ ناریل کی بنی پھارسی میں جو بازاروں میں خوب اور سستی ملتی، پانی بھرتے اور اس میں حقہ فٹ کر دیتے۔

محلے کے کئی لوگ رات کے کھانے کے بعد ہمارے گھر آتے اور بابا سے حقہ مانگ کر پیتے۔ خاص طور پر ماسٹر شریف صاحب جنھیں 'گبو ماسٹر' کہا جاتا تھا، بابا کے پاس بیٹھتے، حقہ پیتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ ماسٹر شریف صاحب نام کے ساتھ ساتھ مزاج کے بھی شریف تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں کسی نواب کے یہاں کچھ دن گزارے تھے جس کی وجہ سے انھیں مختلف قسم کے کھانوں کے نام یاد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان جن کو کھانے کے نام پر روٹی چٹنی، دال روٹی اور گولاتھی کے علاوہ کوئی نام نہ معلوم ہو اور پینے کے نام پر پانی کے علاوہ پچھ اور حقہ و بیڑی کے علاوہ کچھ نہ جانتے ہوں، ان لوگوں کو جب انواع و اقسام کے مرغن کھانوں اور مشروبات کے بارے میں بتایا جائے تو ان کے نزدیک تو یہ الف لیلیٰ کی داستانوں جیسی بات ہوتی۔ اور جب ماسٹر شریف صاحب اپنی لچھے دار گفتگو کے دوران کھانوں کے نام گناتے تو لوگ ان کی 'دستر خوان دانی' پر عش عش کر اٹھتے۔ وہ پہلے بارہ بنکی کے قریب ایک قصبہ ٹیرہ ٹکرہ میں پڑھاتے تھے بعد میں گاؤں کے مدرسے میں پڑھانے لگے۔ ہم لوگوں نے ان جیسا محنتی اور مخلص استاد نہیں دیکھا۔

ان کا گھر ہمارے ہی محلے میں تھا۔ ہمارے اور ان کے گھر کے درمیان پانچ گھر اور ایک مسجد پڑتی۔ وہ بعد نماز مغرب کھانا کھانے کے بعد جب گھر سے چلتے تو نظر آجاتے۔ ہم لوگ آپس میں مذاق کرنے لگتے کہ ابھی ماسٹر صاحب آتے ہی کہیں گے ''اے نبو بابو''۔ اور بابا کہیں گے ''ہاں گبو بابو''۔

اور پھر وہی ہوتا وہ دو گھر دور سے ہی آواز لگاتے: ''نبو بابو ہیں'' اور بابا جواب دیتے

''ہاں گبو بابو آؤ حقہ تیار ہے''۔

وہ کچھ دیر تک بیٹھ کر حقہ پیتے، گپ شپ کرتے اور اسی درمیان عشا کی اذان ہو جاتی اور پھر وہ مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ یہ ان کا یومیہ کا معمول تھا۔ ان کے جانے کے بعد بابا اپنے بستر پر دراز ہو جاتے۔

بابا ہماری اماں کو بالکل اپنی بیٹی کی طرح مانتے تھے بلکہ ان کی اپنی بیٹی کے انتقال کے بعد تو انھوں نے اماں کو بیٹی ہی مان لیا تھا۔ کبھی کسی بات پر نہ جھڑکتے نہ ناراض ہوتے۔ اماں جو کہتیں سر جھکا کر مان لیتے۔ اماں ان کو چچا کہتیں مگر اندر سے وہ بھی ان کو باپ ہی مانتی رہی ہیں۔ انھوں نے بابا کی محبت اور شفقت کا جواب ان کی خدمت سے دیا۔

انتقال سے دو تین سال قبل بابا کو فالج مار گیا۔ جسم کا بایاں حصہ بیکار ہو گیا۔ اماں پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی۔ جو کوئی بھی شخص کوئی دوا بتاتا فوراً اس کا انتظام کرتیں۔ دوائیں بھی ساری دیسی ہوتیں۔ جس گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوں، روٹی چٹنی اور گولا تھی پر گزارہ ہو رہا ہو اس گھر کے لوگ اسپتال جانے اور انگریزی دوا کرانے کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتے تھے۔ ہفتہ دس دن تک دیسی دوائیں خوب آزمائی گئیں۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بابا نے ایک روز اماں سے کہا:

''کیوں پریشان ہو رہی ہو، رہنے دو ایسے ہی، جو اللہ کی مرضی''۔

باہر برآمدے میں ان کی چارپائی بچھا دی گئی۔ مگر جب پیشاب پاخانہ بستر پر ہو رہا ہو تو برآمدے میں کب تک انھیں رکھا جاتا۔ مکان کے سامنے عام راستہ ہے جو ہمیشہ چالو رہتا۔ ایک روز بابا نے اماں سے کہا کہ مجھے اندر گھر میں کر دو۔ اندر آنگن تھا۔ جس کے سامنے اور دائیں بائیں ایک ایک کمرہ تھا۔ شمالی سمت والے کمرے میں ان کی چارپائی ڈال دی گئی۔ وہیں کھانا پینا ہوتا اور پیشاب پاخانہ بھی۔ کوئی کیسے کہاں لے جاتا۔ وہ کم و بیش تین سال تک اسی عالم بے بسی میں رہے۔ لیکن گاؤں تو گاؤں محلے والوں کو بھی کبھی اس کی بھنک نہیں لگی کہ اماں ان کا پیشاب پاخانہ کب اور کہاں لے جا کر پھینکتی ہیں۔ اس کا احساس لوگوں کو بابا کے انتقال کے بعد ہوا۔

ہم لوگ جو کہ اب بڑے یعنی جوان ہو گئے تھے، دو ایک روز کے بعد ان کے کمرے میں جاتے، چارپائی کی پٹی پر بیٹھ جاتے اور خیر خیریت کے علاوہ ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے۔

کبھی کبھار تو کئی کئی روز گزر جاتے۔ مگر بابا کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے اور یہ نہیں کہتے کہ میں چوبیس گھنٹے یہیں اکیلا پڑا رہتا ہوں تم لوگ کہاں رہتے ہو کیوں نہیں آتے۔ ہاں جب ہم لوگوں کو دیکھتے تو ان کے چہرے پر ایک فطری سی مسکراہٹ کھیل جاتی۔

ہم لوگوں کی گنہگار آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ بابا ابا کا ایسے احترام کرتے جیسے وہ ان کے بھتیجے نہیں بلکہ باپ ہوں۔ ابا بھی ان کا بہت لحاظ کرتے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ بابا نے ابا کو یا ابا نے بابا کو کچھ کہا ہو۔

جب ان کا آخری وقت آیا تو اس وقت ابا گھر ہی پر تھے۔ بابا کی چارپائی ان کے مخصوص کمرے سے نکال کر باہر کے کمرے میں رکھ دی گئی۔ تلاوت قرآن مجید ہونے لگی۔ تھوڑی دیر تک نزع کا عالم رہا۔ اماں کا برا حال تھا۔ ابا باہر برآمدے میں لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں کبھی باہر جاتا تو کبھی اندر جا کر بابا کی صورت دیکھتا۔ اور پھر چند گھنٹے کے اندر اندر بابا ہم لوگوں کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ میں نے پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا۔ وہ منظر آج بھی میری نگاہوں میں ہے اور میں جب بھی اس منظر کو یاد کرتا ہوں تو بہت سے سوالات میں خود گھر ا جاتا ہوں۔ جب ان کو قبر میں اتار کر گھر آئے تو یوں لگا کہ جیسے صرف بابا ہی نہیں بلکہ پورا گھر مر گیا ہے:

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

بابا روزہ تو پابندی سے رکھتے لیکن نماز صرف جمعہ اور عیدین کی پڑھتے۔ ابا پہلے ان کو نماز کے لیے کہتے لیکن جب انھوں نے کوئی اثر نہیں لیا تو انھوں نے کہنا چھوڑ دیا۔ بار بار میرے ذہن میں یہ بات گونجتی ہے کہ وہ بے نمازی مسلمان بہت سے زاہدوں اور عابدوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس نے نہ تو کبھی کسی کا دل توڑا اور نہ ہی کسی سے لڑائی کی۔ اگر کسی معمولی بات پر کسی سے کہا سنی بھی ہوئی تو اسے دل میں نہیں رکھا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر سلام کلام شروع کر دیا۔

کیا ایسے شریف اور فرشتہ صفت انسان سے جو اللہ کے بندوں کی خدمت کرتا رہا ہو اللہ ناراض ہو سکتا ہے۔ اللہ نے اب شاید ایسے انسان بنانے بند کر دیے ہیں۔

☆☆

حماد انجم ایڈوکیٹ

(اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے)

یادش بخیر! یہ ۱۹۶۸ کا سال ہے۔ ایک لڑکا درجہ پانچ کے بورڈ کے امتحان میں خراب پرچہ کرنے کے باوجود پاس ہوگیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ خوشی اس بات کی کم کہ وہ چھٹی کلاس میں پہنچ گیا، اس بات کی زیادہ کہ وہ جس اسکول میں داخلہ لے گا اس میں کرسی میز پر بیٹھنے کو ملے گا۔ ان دنوں بیشتر اسکولوں میں بچے ٹاٹ پٹی پر بیٹھتے تھے۔ کرسی میز کا انتظام بڑے اسکولوں میں ہوا کرتا تھا چھوٹوں میں نہیں۔ جس اسکول میں داخلہ لینا ہے وہ بھی کوئی بڑا اسکول نہیں۔ صرف چھٹی کلاس میں کرسی میز کا انتظام ہے باقی میں ٹاٹ پٹی کا۔ چھٹی میں اس لیے کہ اس کے لالچ میں زیادہ بچے داخلہ لیں۔ گویا میز کرسی نئے پرندوں کو پھانسنے کے لیے دام ودانہ کا انتظام ہے۔

ان دنوں کسی کسی اسکول میں یونیفارم ہوتا۔ وہ بھی خاکی قمیض اور خاکی پینٹ۔ اب یہ نہیں معلوم کہ خاکی یونیفارم کا مقصد حب الوطنی کا مظاہرہ تھا یا کچھ اور۔ لیکن بہر حال یونیفارم معصوم بچوں کے لیے باعث کشش تھا۔ اس اسکول میں بھی یونیفارم کا چلن تھا۔ اگر چہ کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ کیونکہ بعد کے کلاسوں میں لڑکے اس کے بغیر بھی جاتے رہے۔ اس لڑکے کا بھی یونیفارم سلا گیا مگر اسکول جانے کی تاریخ تک صرف قمیض ہی تیار ہو سکی۔ ادھر اشتیاق کا یہ عالم کہ اسکول تو جانا ہے یونیفارم ہو یا نہ ہو۔ اس نے اوپر قمیض پہنی اور نیچے ایک جانگھیا۔ اور چل پڑا اسکول کی جانب۔ خالی ہاتھ۔ ابھی تک کورس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ لہٰذا نہ بستہ، نہ

کتابیں، نہ کاپیاں۔ دیوانگی کا یہ عالم کہ پیر میں جوتا، نہ چپل۔ اس کے لیے ایک دن بھی رکنا منظور نہیں۔ اسکول جانے کی خوشی ہی کچھ ایسی تھی۔

معصوم امنگیں جھول رہی تھیں دلداری کے جھولے میں

لڑکے کے بڑے بھائی ایک سال آگے ہیں۔ وہ یونیفارم میں ہیں۔ کتابیں کاپیاں ان کے پاس بھی نہیں۔ ان کے کچھ ہم جماعت بھی ساتھ میں ہیں۔ یہ ننھا سا قافلہ جوش خروش کے ساتھ پہلے ہی روز اسکول پہنچ جاتا ہے۔ ان دنوں ہفتہ دس دن بلکہ پندرہ دنوں تک کلاسوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوتا تھا۔ داخلے ہوتے اور پھر کھیل کود۔ دوپہر تک اسکول میں ٹھہرنے کے بعد یہ ننھا قافلہ واپسی کی راہ پکڑتا ہے۔ مگر راستہ بدل کر۔ پلان بنا کہ دوسرے راستے سے چلیں گے جس پر جامن اور آم کے درخت ہیں۔ راستے میں جامن توڑ توڑ کر کھائے جا رہے ہیں۔ ادھر مذکورہ لڑکے کا ایک پاؤں، جو کہ جوتا چپل سے بے نیاز ہے، ایک تتیا کے اوپر پڑ جاتا ہے۔ اس نے ڈنک مارا۔ زور کی ٹیس ہوئی۔ مگر یہ ٹیس خوشیوں کو دبا نہیں سکی۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ دوسرے باغ سے گزرے تو دوسرا پاؤں بھی تتیا پر پڑ گیا۔ (مقامی زبان میں اسے ہڈّا اور ہڈّی کہتے ہیں)۔ اب دونوں پاؤں کے تلوے زخمی ہو گئے۔ لیکن یہ دونوں زخم بھی خوشیوں کا گلا نہیں گھونٹ سکے۔ (گاؤں سے اسکول کی مسافت کم از کم تین چار کلومیٹر ہے)۔

خود اپنا ذوق اسیری ہے پاؤں کی زنجیر
حضور آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں

وہ لڑکا یہ خاکسار تھا اور بڑے بھائی ابوالاثر انصاری تھے۔ وہ اس وقت تک حماد انجم نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چپکے سے اسکول کے لیے روانہ ہوئے تھے تاکہ میں ان کا پیچھا نہ پکڑ لوں۔ مجھے خبر ہو گئی۔ میں قمیض اور جانگھیا میں دوڑ پڑا۔ دیکھا تو وہ لوگ کافی آگے ہیں۔ وہ یارانِ تیز گام تھے اور منزل کی جانب رواں دواں بھی۔ میں ''بھیا بھیا'' کرتا ہوا غبار کارواں کی مانند پیچھے پیچھے بھاگا۔ ان کو بہت غصہ آیا۔ وہ شروع سے ہی غصیل مزاج کے تھے۔ لیکن پھر تھوڑا سا ڈانٹ کر کہ یہ کس حلیے میں آ رہے ہو؟ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس دن جو مستی کی گئی اس کی ایک ایک بات آج تک یاد ہے۔

ہم اسکولی بچوں کا ایک گروپ بن گیا۔ جس میں میرے ہم عمر کم اور بھائی کے ہم عمر اور دوست زیادہ۔ خلیل الرحمٰن صاحب (جنھوں نے بھائی کے ساتھ بی ایس سی اور ایل ایل بی کیا)، شمیم اختر اور مبارک حسین بھی اس گروپ میں تھے۔ مبارک اور میں ہم جماعت تھے اور باقی سب ایک درجہ آگے۔ مجھے ان لوگوں کی باتیں اچھی لگتیں۔ خاص طور پر بھائی کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی۔ لہٰذا میری کوشش ہوتی کہ ان لوگوں کے ساتھ ہی رہوں۔ حالانکہ بھائی اندر ہی اندر چاہتے کہ یہ ہم لوگوں کے ساتھ نہ رہے۔ آزادی اور حفظ مراتب کا معاملہ تھا۔ لیکن میں اس قسم کی باتیں جانتا تھا نہ سمجھتا تھا۔

ساتھ جاتے اور آتے کئی سال گزر گئے۔ یہاں تک کہ بھائی نے ہائی اسکول کر لیا اور جگت گرو شنکر آچاریہ انٹر کالج مہنداول، ضلع بستی، اتر پردیش میں انٹر میں داخلہ لے لیا۔ اگلے سال میں بھی ہائی اسکول کر کے اسی کالج میں پہنچ گیا۔ کالج ہمارے گاؤں سے تیرہ چودہ کلومیٹر دور۔ ابا نے ایک سائیکل خرید دی۔ دوسرے سال میں بھی اسی پر سوار ہو گیا۔ اب پھر بھائی کا ساتھ۔ اور ایسا ویسا نہیں بلکہ بہت خاص۔ وہ پورے ایک سال تک مجھے سائیکل پر بٹھا کر کالج لے جاتے اور لاتے۔ دو وزنی بستوں کا بوجھ الگ۔ بعد میں مجھے اس کا بہت احساس ہوا اور آج تک ہے۔ اگر چہ ہم دونوں سگے اور تلے اوپر کے بھائی تھے مگر اس طرح صبر و شکر کے ساتھ پورے ایک سال تک سائیکل پر بٹھا کر چودہ کلومیٹر آنا اور جانا معمولی بات نہیں۔ اسے میں اپنے اوپر ان کا احسان سمجھتا ہوں۔ ورنہ پتہ نہیں میرے کالج جانے کا کیا ہوتا۔

انٹر کرنے کے بعد بھائی نے گورکھپور یونیورسٹی میں بی ایس سی میں داخلہ لیا۔ میری بدقسمتی کہ میں انٹر کے فائنل ائیر میں انگریزی میں فیل ہو گیا۔ اگلے سال پرائیویٹ امتحان دینے کا فیصلہ ہوا۔ چونکہ بھائی خلیل الرحمٰن اور مبارک حسین کے ساتھ گورکھپور میں زیر تعلیم تھے لہٰذا گھر والوں نے گورکھپور کے کسی کالج سے پرائیویٹ انٹر کرانے کا ارادہ کیا۔ میں نے مارواڑ انٹر کالج سے فارم پُر کیا۔ خلیل الرحمٰن بھی بی ایس سی کر رہے تھے اور مبارک حسین جواب مجھ سے ایک سال آگے ہو گئے تھے، ڈپلومہ انجینئرنگ کر رہے تھے۔ وہ لوگ محلہ تیرا پور میں سنّبل کے گھر میں کرایے کا ایک چھوٹا سا کمرہ لے کر رہتے تھے۔ وہ اتنا تنگ تھا کہ اس میں ایک ہی شخص رہ سکتا تھا۔ وہاں

تین تین رہ رہے تھے۔ اب امتحان سے ایک دو ماہ قبل گھر والوں نے تیاری کرنے کے لیے مجھے بھی وہیں بھیج دیا۔ میں پھر بھائی کے پاس پہنچ گیا۔ بہر حال امتحان دیا۔ سینٹر بہت دور پر انچ نامی قصبے میں پڑا۔ پہلے انگریزی میں فیل ہوا تھا۔ اس بار اسی میں سب سے زیادہ نمبر آئے۔

اب یہاں سے کچھ برسوں کے لیے بھائی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ وہ اس طرح کہ میں نے ضلع سدھارتھ نگر کے، جو کہ اس وقت تک بستی تھا، رتن سین ڈگری کالج بانسی میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ بی اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ لیکن ہم دونوں بھائیوں میں بچپن سے ہی جو قربت تھی اور تھوڑی بہت بے تکلفی بھی، وہ کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی۔

اسی درمیان ہمارے والد صاحب نے معاشرے کی اصلاح کے لیے گاؤں میں نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ جس کا نام انھوں نے ''بزم نوجوانانِ اہل حدیث'' رکھا۔ بھائی کو تنظیم کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ تنظیم کے قیام کے وقت ہمارے گاؤں میں اور پھر قرب و جوار میں بھی عجیب وغریب جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ نوجوان طبقہ سماج اور قوم کی اصلاح کے لیے سرگرم ہو گیا۔ اس کے قیام کے وقت گاؤں کے بازار میں رات میں افتتاحی پروگرام رکھا گیا۔ ان دنوں ہمارے والد کی تحریک پر شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا۔ اکثر لوگ شاعری کرتے اور مشاعروں کا بھی اہتمام کرتے۔ اس موقع پر میرے دل میں بھی شاعری کا جذبہ پیدا ہوا۔ میں نے پروگرام کی مناسبت سے ایک نظم کہی اور والد صاحب کو لے جا کر دکھائی۔

''یہ تم نے لکھی ہے؟'' ابا نے پوچھا۔ میرے ہاں کہنے پر انھیں یقین نہیں آیا۔ انھوں نے سمجھا کسی سے لکھوا لیا ہوگا۔ میرا امتحان لینے کی غرض سے انھوں نے کہا کہ اچھا جاؤ اس کا مقطع لکھ کر لاؤ۔ میں نے پوچھا تخلص؟ کہنے لگے کہ یہی ''سہیل'' اور کیا۔

میں مقطع لکھ کر لے گیا اور انہیں دکھلایا۔ انھوں نے نظم کی نوک پلک درست کی۔ جسے میں نے بزم کے افتتاحیہ اجلاس میں ترنم سے پڑھا۔ اس کا پہلا شعر یوں تھا:

آج کی یہ انجمن خوشیاں بہت سی لائی ہے
اور بھینی بھینی خوشبو ہر طرف مہکائی ہے

ابا نے تقریر کی اور میری شعر گوئی پر اظہار حیرت کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ابوالاثر شاعری کرتا ہے۔ لیکن شاعر تو سہیل نکلا۔ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کے لیے اس نظم کی بے حد تعریف کی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے خوش ہو کر انعامات کی بارش کر دی۔ یہ غالباً ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے۔ اس وقت مجھے اس نظم پر تقریباً ساٹھ ستر روپے بطور انعام ملے۔

ادھر ابا نے بھیا کے نام میں ''حماد انجم'' کا اضافہ پہلے ہی کر دیا تھا۔ گویا انھوں نے لاشعوری طور پر بھیا کے ذہن میں شاعری کی تخم ریزی کا انتظام کر دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا کہ وہ واقعی شاعری کرتے ہیں۔ اس وقت تک خاصی شاعری کر چکے ہیں۔ ان کا کلام بھی معیاری ہے۔ ان کی شاعری کے آگے میری شاعری طفل مکتب ہے۔ رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا کہ دونوں بھائی شاعر ہیں۔ ہم لوگوں کا کلام بھی مختلف رسالوں میں شائع ہونے لگا۔ ہم دونوں بعض اوقات کسی مصرعے پر ساتھ ساتھ طبع آزمائی بھی کرتے۔ کبھی کبھار رسالوں میں شاعری کے مقابلے میں حصہ بھی لیتے۔ غرضیکہ انھوں نے بھی شاعری میں میری حوصلہ افزائی کی۔

لیکن ۱۹۸۴ میں بغرض ملازمت دہلی آنے کے بعد شاعری کا میرا سفر کمزور پڑتے پڑتے ختم ہو گیا۔ جدوجہدِ زیست نے مجھ سے یہ فن چھین لیا۔ یہاں تک کہ میرے اندر کا شاعر کومہ میں چلا گیا یا اپنی موت آپ مر گیا۔ بعد میں جب تھوڑی بہت آسودگی ہوئی تو میں نے اپنے اندر کے شاعر کو ٹہوکے لگا لگا کر جگانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

اب تک ابوالاثر انصاری ایڈوکیٹ حماد انجم ایڈوکیٹ بن چکے تھے۔ قرب و جوار میں بھی ان کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ مشاعروں اور نشستوں میں بلائے جانے لگے۔

میں دہلی سے جب بھی گھر جاتا تو ہم دونوں کا بیشتر وقت ایک ساتھ گزرتا۔ وہ ہم پانچ بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ وہ چھوٹے بھائی شمس کمال انجم سے بے حد محبت کرتے تھے۔ لیکن ساتھ میں زیادہ وقت ہم دونوں کا گزرا۔ اس درمیان پہلے انھوں نے بستی کے معروف وکیل مسعود الحسن انصاری کی جونیئر شپ میں جو کہ ان کے سسرالی رشتے دار تھے، بستی کی عدالت میں وکالت سیکھی۔ اس کے بعد بانسی تحصیل میں اور پھر مہنداول تحصیل بننے کے بعد وہاں پریکٹس کرنے لگے۔

اس سے قبل میں نے کوشش کی کہ وہ دہلی میں قسمت آزمائی کریں۔ میرے کہنے پر وہ آئے بھی۔ لیکن معاملہ جما نہیں۔ واپس چلے گئے۔ درمیان کے دس بارہ سال ہم لوگوں کی جدوجہد کے سال رہے۔ میں دہلی میں چکی کی مشقت میں مبتلا رہا اور وہ وطن میں۔ چکی کی مشقت نے میری مشق سخن کا گلا تو گھونٹ دیا لیکن ان کی مشق سخن کی لے تیز ہوگئی۔ ان کی شاعری کا معیار اونچا ہوتا گیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ:

چاند تاروں پر کمندیں ڈالنا اچھا لگا
حوصلہ کہتا ہے زیر دام گردوں چاہیے

(حماد انجم)

وہ مشکل شاعری کرتے۔ ابا ہمیشہ ان کو سمجھاتے کہ آسان زبان میں شاعری کرو۔ لیکن شاعری کوئی کسی چیز تو نہیں کہ جب چاہا آسان زبان میں کہہ لیا اور جب چاہا مشکل زبان اختیار کرلی۔ ان کی شاعری کا رنگ الگ ہے اور ابا کا الگ۔

جدوجہد کے اس دور میں بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب رہے۔ میں نے جب بھی ان سے کوئی کام کہا انھوں نے فوراً کیا۔ یہاں تک کہ ایک بار میرے بچوں کو میری درخواست پر دہلی چھوڑنے لائے۔ حالانکہ اگر میرے سامنے ملازمت سے چھٹی کا مسئلہ تھا تو ان کے سامنے بھی تھا۔ لیکن انھوں نے انکار نہیں کیا۔

اسی درمیان جبکہ ابا کو میری ملازمت کی بہت زیادہ فکر تھی، ایک بار کسی نے ان کو کسی سرکاری ویکنسی کے بارے میں بتایا۔ وہ ہرنام پور نیپال سے فوراً گھر آئے اور ہم لوگوں کو اس کے بارے میں بتایا۔ میں اس وقت چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا۔ اسی روز مجھے دہلی آنا تھا۔ جس ویکنسی کی بات ہوئی تھی اس کے لیے تصویروں کی ضرورت تھی۔ اس وقت میرے پاس میری کوئی تصویر نہیں تھی۔ بھیا نے فوراً موٹر سائیکل پر بٹھایا اور گھر سے تقریباً ۱۵ کلومیٹر دور بلوہا لے گئے اور ایک اسٹوڈیو میں فوٹو کھنچوائی۔ وہ ایک سعی لاحاصل تھی۔ اس میں میری کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں دہلی میں صحافت کی وادیٔ پرخار میں آبلہ پائی کے مراحل طے کر رہا تھا اور اسی میں خوش تھا۔

حماد بھائی کی شاعری کا سفر پوری رفتار کے ساتھ جاری تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ جو

شائع ہوا، حمد یہ تھا جس کا نام "بہار حمد" ہے۔ گویا اشاعت کا پہلا قدم بہت مبارک تھا۔ وہ مجموعہ دسمبر ۱۹۸۱ میں منظر عام پر آیا۔ جس میں بھیا سے زیادہ ابا نے دلچسپی لی۔ کچھ اشتراک میرا بھی رہا۔ اس کا تعارف ہمارے علاقے کے معروف شاعر جنھیں لوگ "حفیظِ ثانی" کہتے تھے یعنی حضرت مولانا ذکر اللہ ذاکر ندوی نے لکھا۔

حماد بھائی نے "اپنی باتیں" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی تحریر لکھی جس میں انھوں نے لکھا:

"شعرا کرام فقط دو چار حمد بطور تبرک کہنے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میں نے نسبتاً زیادہ حمدیں کہی ہیں۔ میرے نظریے کے مطابق زیادہ سے زیادہ حمد کہنا مستحسن ہے۔ جب روئے زمین پر جنم لینے والے چرند و پرند، مور و مگس، جن و حیوان، نباتات و جمادات سب کے سب ہمہ وقت خالق حقیقی کی کبریائی کے گن گاتے رہتے ہیں، تو ہم انسانوں پر بدرجۂ اولیٰ لازم ہے کہ صبح و شام خدائے واحد و جبروت کی حمد و ثنا کا ڈنکا بجائیں۔ ارباب علم و دانشِ شعر و سخن کا حمد پر زیادہ توجہ نہ دینا علم و فن اور فکر و نظر کا دیوالیہ پن ہے"۔

حمد کے بعد نعت کا مقام ہے لہٰذا حماد بھائی کا دوسرا شعری مجموعہ "شمع حرا" کے نام سے منظر عام پر آیا جسے میں نے دہلی سے چھپوایا۔ یہ مارچ ۱۹۸۹ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد حمدوں، نعتوں، نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "خوشۂ کشت حرم" ...... میں شائع ہوا۔ اسے مرکز التوحید (مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ) کے بانی اور سرپرست مولانا عبداللہ مدنی نے اپنے ادارے کرشنا نگر نیپال سے شائع کیا۔ چوتھا مجموعہ "شاخ گل تر" ۲۰۱۱ میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا۔ پانچواں مجموعہ "نور نادیدہ" جو کہ صرف نظموں پر مشتمل ہے میں نے دہلی سے ۲۰۱۴ میں شائع کیا۔ جبکہ کم از کم دس مجموعے منتظر اشاعت ہیں۔

ہم لوگ اکثر حماد بھائی سے کہتے کہ آپ نے اتنی زیادہ شاعری کی ہے، کئی شعری مجموعے تیار ہیں، ان کو چھپواتے کیوں نہیں؟ وہ کوئی جواب نہیں دیتے۔ ایک بار شمس کمال انجم نے ان سے بہ اصرار اور ذرا تیز لہجے میں کہا کہ:

"بھیا آپ اپنے مجموعے کیوں نہیں چھپواتے"۔

انھوں نے بڑی حسرت سے کہا:

''چاہتا تو میں بھی ہوں کہ چھپواؤں مگر میرے پاس پیسے کہاں ہیں''۔ بقول خود:

یہ نصیب اپنا ہے انجم کہ جو گمنام رہے
یہی پہچان ہماری ہے کہ مشہور نہیں

اس کے بعد میں نے ان کی ایک بیاض مانگی۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور جو ڈائری ہاتھ لگی مجھے دے دی۔ پوچھا کیا کروگے؟ میں نے کہا دیکھتا ہوں اگر کچھ انتظام ہوا تو چھپواؤں گا۔ وہ خاموش ہو گئے۔

اس ڈائری کو لائے ہوئے کئی سال ہو گئے۔ میں اپنی مصروفیات میں جکڑا رہا۔ لیکن انھوں نے کبھی اس کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔

اس درمیان ۲۰۱۲ میں میرے بیٹے سلمان فیصل کی شادی دہلی میں طے ہو گئی۔ حماد بھائی چاہتے تھے کہ وطن ہی میں کہیں ہو۔ انھوں نے کئی جگہ رشتے بھی دیکھے۔ لیکن ہم لوگوں کی سردمہری کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔ جو دہلی میں رہنے لگے وہ باہر کہاں نکلنا چاہتا ہے۔ تاریخ طے ہو گئی۔ میں نے حماد بھائی سے کہا کہ آپ کو آنا ہے اور گھر کے لوگوں کو بھی لانا ہے۔ ۲۳ دسمبر کو شادی ہوئی اور ۲۴ دسمبر کو ولیمہ۔ اس سال ان دنوں زبردست کہرا پڑ رہا تھا۔ حماد بھائی گھر کے دس پندرہ افراد اور اپنے ایک قریبی دوست شہرت علی انصاری کے ساتھ انتہائی پریشانی اٹھا کر جبکہ ٹرینیں بیس بیس گھنٹے لیٹ چل رہی تھیں، دہلی آئے۔ شادی میں شریک ہوئے۔ ان لوگوں کی پریشانی دیکھ کر ہم لوگ بہت شرمندہ ہوئے۔

طے پایا تھا کہ تیسرے دن ہم لوگ وطن جائیں گے۔ ٹکٹ بہت پہلے بنوا لیا تھا۔ مگر موسم کی سختی اور بچوں کی ناسازگی طبع کی وجہ سے ہمت نہیں ہوئی۔ جبکہ وہاں ولیمے کا انھوں نے پورا انتظام کر رکھا تھا۔

دسمبر ۲۰۱۳ میں ہمارے یہاں پوتے کی ولادت ہوئی۔ ہم نے بھیا سے کہا کہ ہم اخراجات بھیج دیتے ہیں آپ وہاں بھی عقیقہ کروا دیجیے۔ حالانکہ ان کو بہت دشواری اٹھانی پڑی لیکن انھوں نے انکار نہیں کیا اور ہم لوگوں کی موجودگی کے بغیر عقیقہ کروا دیا۔

اسی بیچ ممبئی کے ماہنامہ شاعر نے ڈاکٹر شمس کمال انجم پر، جو کہ بابا غلام شاہ بادشاہ

یونیورسٹی راجوری جموں میں شعبہ عربی کے صدر ہیں، ایک گوشہ نکالنے کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی رباعی پر کچھ مضامین کا بھی اعلان کیا۔ حماد بھائی نے بڑی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ میں وطن گیا ہوا تھا۔ انھوں نے وہ تمام رباعیاں اور کچھ مضامین میرے حوالے کیے اور کہا کہ انھیں شمس کمال کو دے دینا۔ وہ شاعر کو بھیج دیں گے۔ دہلی میں لوگ کس قدر مصروف رہتے ہیں اس کا اندازہ دہلی والوں کو ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک تو جموں سے شمس کمال کی آمد بہت کم رہی اور دوسرے افکار و حوادث میں گھرے رہنے کی وجہ سے یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔

شاعر کے گوشے کی اشاعت کا وقت قریب آیا تو شمس کمال نے حماد بھائی کو فون کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو سہیل کو دے چکا ہوں۔ شائد اسی رات انھوں نے مجھے فون کیا۔ بڑی دل برداشتگی اور ناراضگی کے ساتھ باتوں باتوں میں انھوں نے کہا:

''آپ کو دوسروں کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف اپنے کام سے دلچسپی ہے''۔

یہ جملہ سنتے ہی میرے تو ہوش اڑ گئے۔ میں نے بہت جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کو اطمینان نہیں ہوا۔ غلطی میری ہی تھی۔ اگر شمس نہیں آ رہے تھے تو مجھے ان سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ لیکن سچ بات یہی ہے کہ گردش دوراں نے یہ بات میرے شعور سے محو کر دی تھی۔ میں نے فوراً شمس کمال کو فون کیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں ابھی تاخیر نہیں ہوئی۔ میں لے لوں گا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن میرے دل میں ان کی وہ بات گھر کر گئی۔ مجھے اس کا بڑا رنج رہا کہ میری سستی و کاہلی کی وجہ سے انھیں میرے بارے میں یہ رائے قائم کرنی پڑی۔ حالانکہ میرے اس غیر شعوری رویے سے یہ خیال قائم کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔

میں نے ان کے دل سے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ان کی ڈائری نکالی اور اس میں سے نظموں کا انتخاب کر کے ''نور نادیدہ'' کے نام سے اسے شائع کروا دیا اور پھر بذریعہ ٹرانسپورٹ ان کے پاس بھجوا دیا۔

وہ بڑے مشتعل مزاج اور طمطراق والے انسان تھے۔ ان کے سامنے گھر کا اور باہر کا بھی کوئی فرد ان کے خلاف لب کشائی کی جرات نہیں کر پاتا۔

فروری ۲۰۱۳ سے لے کر فروری ۲۰۱۵ تک کا وقفہ ہمارے اہل خانہ کے لیے بڑی

آزمائشوں کا رہا۔ ۷ افروری ۲۰۱۳ کو ہمارے والد کا دست شفقت ہم لوگوں کے سروں سے اٹھ گیا۔ ۱۴ افروری ۲۰۱۴ کو میری اہلیہ اسی غم سے دوچار ہوئیں، یعنی ہمارے خسر محمد فاروق صاحب بھی رخصت ہو گئے۔ ۲۵ جنوری ۲۰۱۵ کو ہم لوگوں کے ایک بہت ہی قریبی، رشتے دار، دوست اور بھائی محمود الحسن انصاری دنیا کو خیر باد کہہ گئے اور ۸ فروری ۲۰۱۵ کو حماد بھائی داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے یوں چلے جانے سے ہم پانچ بھائیوں کا سب سے بڑا بازو کٹ گیا۔

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم یہ سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ان کے انتقال سے صرف ہمارے خاندان کا ہی نقصان نہیں ہوا بلکہ علم وادب کا بھی خسارہ ہوا ہے۔

بنائے تھے شوق کے گھروندے، طلسم باندھا تھا رنگ و بو کا
لگائی دنیا نے ایسی ٹھوکر، اچٹ گیا خواب آرزو کا

وہ ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ پیشے سے وکیل تھے تو ذوق سے شاعر اور ادیب تھے۔ خوش اخلاق تھے، خوش گفتار تھے، بذلہ سنج تھے، حاضر جواب تھے۔

ان کے انتقال سے مشرقی اتر پردیش کے بستی، سدھارتھ نگر اور سنت کبیر نگر اضلاع کے ادبی حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ کئی روز تک ادبی تنظیموں کی جانب سے تعزیتی نشستیں ہوتی رہیں۔ شاعری ان کو ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے ابا کی شعری وادبی وراثت سنبھال رکھی تھی۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا کلام ملک کے معتبر رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بہت ہے۔ ان کو ان کے انتقال سے اتنا دکھ ہوا کہ کئی لوگ بالخصوص شہرت صاحب یہ کہتے سنے گئے کہ ان کی نہیں ہماری موت ہوئی ہے۔

سننے والے رو دیے سن کر مریض غم کا حال
دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے

انھیں انگریزی، اردو اور ہندی پر عبور حاصل تھا۔ نظم وندے ماترم کا انھوں نے پانچ انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک ہندی نثر میں، دوسرا اردو نثر میں اور تین مختلف شعری پیرایوں میں۔

کئی ہندی شاعروں کی مشہور نظموں کا انھوں نے اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔

وہ کم وبیش چار دہائیوں سے شعروسخن کی خدمت میں مصروف تھے۔ وہ مختلف اصناف میں اظہار کا ملکہ رکھتے تھے۔ حمد، نعت، نظم، غزل، مسدس، مخمس، قطعہ، رباعی اور دوسری اصناف میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کر رہے تھے۔ انھیں عروض کا زبردست علم تھا۔ انھوں نے عہد حاضر کے کئی بڑے شعرا کے کلام کا عروض کی روشنی میں جائزہ لیا تھا۔

ادبی رجحانات پر بھی ان کی نظر تھی۔ کلام کے علاوہ ان کے ادبی مضامین بھی رسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ جن سے ان کے ادبی ادراک اور خاص طور پر شاعری کے بارے میں ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ صاف ستھرے ادب کے قائل تھے۔ آزادی اظہارِ خیال یا جدید تہذیب کے نام پر ادب میں جو خرافات در آئی ہیں وہ اس کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی ہے اور لفظیات کا انوکھا پن ہے۔ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں تھے۔ ہاں نشستوں میں ضرور شامل ہوتے جہاں منتظمین ان سے صدارت بھی کرواتے۔

ہم دونوں بھائیوں نے اردو کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی تھی۔ میں نے تو بی اے اور ایم اے اردو سے کیا۔ لیکن انھوں نے اردو کا کوئی کورس نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود بڑے بڑے اردو داں ان سے گفتگو کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ عربی اور فارسی کی بھی خاصی شد بد تھی۔ آجکل کے مدارس سے فارغ التحصیل علما اور یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کرنے والے اسکالر ان کی اردو دانی کے آگے ہیچ تھے۔ زبان اور گرامر پر ان کی زبردست گرفت تھی۔

طفل مکتب ہے کہ مولانا نظر آتا ہے

(حماد انجم)

وہ ایک بے حد کامیاب وکیل تھے۔ ابا نے بہت ناز سے ان کو وکالت کی تعلیم دلوائی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس دور میں جبکہ وکلاء پر سے لوگوں کا اعتبار اٹھ گیا ہے اور وکلاء بھی سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کو ہی وکالت کی معراج سمجھتے ہیں، میں معاشرے کو ایک ایماندار اور دیانت دار اور ایک ''مسلمان وکیل'' دینا چاہتا ہوں۔ حماد بھائی نے عمر کے آخری لمحے تک ان کے اس دعوے اور اس ''ناز'' کی لاج رکھی۔ انھوں نے وکالت کے پیشے کے ساتھ بھی

بددیانتی نہیں کی۔ اس کو رسوا نہیں کیا۔ انھوں نے اس پیشے میں ایمانداری کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کی داد اور گواہی ان کے انتقال کے بعد مقامی تحصیل اور ضلع کے سیکڑوں وکلاء، ہندو بھی اور مسلم بھی، ان کا آخری دیدار کر کے دیتے رہے۔

آئی ہے زندگی بھی تو ظالم قضا کے بعد
بیعت کو بادشاہ اٹھا کربلا کے بعد

(حماد انجم)

وہ مقامی تحصیل میں سب سے سینئر اور مقامی و ضلعی تحصیل میں سب سے مقبول وکیل تھے۔ وکلاء برادری میں بھی مقبول تھے اور عوامی حلقوں میں بھی۔ وہ مقامی بار ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ انتہائی مشفقانہ سلوک کرتے۔ موکلوں کے ساتھ کبھی نرم تو کبھی ضرورتاً سخت برتاؤ کرتے۔ وہ کوئی بھی کیس اس وقت تک ہاتھ میں نہیں لیتے جب تک کہ یہ نہ جان لیتے کہ ان کا موکل حق پر ہے۔ انھوں نے پورے کریئر میں جان بوجھ کر کوئی ایسا کیس نہیں لیا جو غلط ہو۔ اگر کبھی بعد میں یہ راز کھلا کہ وہ جس کا مقدمہ لڑ رہے ہیں وہ سچا نہیں ہے تو اسے چھوڑ دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ وکلاء کے علاوہ حکام بھی ان کی عزت کرتے۔ ان کے انتقال پر متعدد حکام بھی غریب خانے پر تعزیت کے لیے تشریف لائے۔

ادھر گھبرا کے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی
ادھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بے خبر ہونا

ہمارے گاؤں لوہرسن بازار کے برابر میں مسلم اکثریت کے ایک بڑے گاؤں لوہرسن کی قبرستان کا تنازعہ اٹھا۔ کچھ فرقہ پرست تنظیموں کے کارکنوں اور لیڈروں نے یہ کہتے ہوئے کہ قبرستان کی زمین گرام پنچایت کی ہے، اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ مقدمہ قائم ہوا۔ فریق مخالف کی طرف سے کئی نامی گرامی وکیل پیروی کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی جانب سے تنہا حماد انجم ایڈوکیٹ لڑ رہے تھے۔ انہی کا شعر ہے:

ہم اہل وفا پیکر تسلیم و رضا ہیں
اک تیر بھی ترکش کا خطا ہونے نہ دیں گے

انھوں نے پوری جان لگا دی۔ مقدمہ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔اس دن انھوں نے کہا کہ ابا نے جو کچھ سوچ کر مجھے وکیل بنایا تھا میں سمجھتا ہوں کہ آج میں نے ان کا خواب پورا کر دیا۔

حق کے لیے ان کی لڑائی اور ملت نوازی کی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ مقدمے کے دوران مخالف پارٹی کے لوگوں نے جو کہ حق پر نہیں تھے، ان کے قدموں میں لاکھوں لاکھ روپے لا کر رکھ دیے اور کہا کہ آپ کیس کی پیروی اس انداز میں کریں کہ آپ کا موکل ہار جائے اور ہم جیت جائیں۔ انھوں نے یہ کہتے ہوئے ان لوگوں کو بھگا دیا کہ تم لوگ میرا ایمان خریدنا چاہتے ہو۔ میرا ایمان بکاؤ مال نہیں ہے۔

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوج خسروانہ

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

مقدمہ میں بحث کے دوران ایک ایک نکتے کو اس انداز میں کھول کر رکھ دیتے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔ حکام بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی بحث کے دوران کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوتا جس میں جونیئر وکیلوں کی اکثریت ہوتی۔ وہ یہ سوچ کر ان کی بحث سنتے کہ انھیں قانونی ٹپس مل جائیں گے۔ بیشتر مقدمات میں ان کے مقابلے میں اعلیٰ عدالتوں سے وکیل بلائے جاتے۔ انھیں بھی دوسری عدالتوں میں بحث کے لیے مدعو کیا جاتا۔

ان کے بے حد قریبی دوست سوریہ پرکاش مشرا سے، جن سے ان کا تیس پینتیس سال سے دوستانہ رشتہ تھا، میں نے پوچھا:

''حماد بھائی کے انتقال کے بعد کیا اس علاقے میں اتنا بڑا کوئی مسلم وکیل ہے''۔

''سہیل بھائی آپ مسلم وکیل کی بات کرتے ہیں اتنا بڑا کوئی ہندو وکیل بھی نہیں ہے''۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا۔

ٹوٹی اسی کی ذات پہ انجم غزل کی تان
اب کوئی قافیہ نہیں اس قافیہ کے بعد

(حماد انجم)

سوریہ پرکاش مشرا پہلے ہمارے گاؤں کے پردھان تھے۔ انھیں پردھانی ہمارے ابا کی کوششوں سے ملی تھی۔ لہٰذا وہ ابا کو اپنا گرو کہتے رہے اور حماد بھائی سے ان کا دوستانہ رشتہ رہا۔ وہ ہم دوسرے بھائیوں کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے ہیں۔ وہ اب پردھان نہیں ہیں۔ مگر انھیں لوگ اب بھی پردھان جی کہتے ہیں۔ وہ بڑے ہنس مکھ، بذلہ سنج، حاضر جواب، خوش مزاج اور روادار انسان ہیں۔ حماد بھائی بھی حاضر جواب اور خوش مزاج تھے۔ کسی کی بات کا ادھار نہیں چھوڑتے۔ لگے ہاتھوں جواب حاضر۔

ایک بار دونوں کہیں جا رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں سگریٹ۔ دونوں کا ابا سے آمنا سامنا ہو گیا۔ فوراً دونوں کے ہاتھ پیچھے گئے۔ سگریٹ نیچے گر گئی۔ لیکن ابا نے دیکھ لیا تھا۔ وہ سگریٹ نوشی کے سخت خلاف تھے۔ اگلے روز انھوں نے سوریہ پرکاش مشرا سے تنہائی میں پوچھا:

"کیا ابوالاثر سگریٹ پیتے ہیں؟"۔

"نہیں قطعی نہیں"۔ پردھان جی نے بلاتوقف جواب دیا۔

"دیکھیے سوچ سمجھ کر بولیے گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے"۔

"آپ نے کیسے دیکھ لیا۔ جبکہ آج تک میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک بار بھی نہیں دیکھا"۔ پردھان جی نے بڑے اعتماد اور ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔

ابا نے انھیں کافی دیر تک گھور کر دیکھنے کے بعد صرف اتنا کہا:

"یا اللہ ایسی دوستی"۔

دوسرے روز پردھان جی نے حماد بھائی کو واقعہ بتایا اور کہا کہ گرو جی تو آپ کے بارے میں ایسے پوچھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا آپ نے کیا جواب دیا۔

"میں نے کہہ دیا کہ میں نے آج تک کبھی بھی ان کو سگریٹ پیتے نہیں دیکھا"۔ پردھان جی نے کہا۔ حماد بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا بالکل صحیح جواب آپ نے دیا۔

بڑے پاک باطن، بڑے پاک طینت
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

بعد میں انھوں نے سگریٹ نوشی ترک کردی تھی۔ایک باران کے کسی وکیل دوست کے ایک موکل نے مقدمہ ہار جانے پر ان سے کہا کہ آپ اس وجہ سے مقدمہ ہار گئے کہ آپ نے ''سیریستا پوروک'' پیروی نہیں کی۔ حماد بھائی نے فوراً کہا کہ آپ نے بھی تو ''گمبھیرلی'' کام نہیں کیا ہوگا۔ (جولوگ ہندی جانتے ہیں وہ ان دونوں الفاظ کی ادائیگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں)۔

وہ سماجی اور سیاسی معاملات میں بھی پیش پیش رہتے۔ متعدد سیاست دانوں سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ جن میں مسلم، غیر مسلم سبھی شامل ہیں۔ وہ تنگ ذہن یا تنگ دل و تنگ نظر نہیں تھے۔ ان کے مزاج میں توسع تھا۔ مذہبی یا مسلکی تعصب سے کوسوں دور تھے۔ باوجود اس کے کہ ملی و مذہبی غیرت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ غیر مسلموں سے بھی ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ سبھی ان کی عزت کرتے۔ ان کے منشی گاؤں ہی کے بنسی دھر گپتا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال پر بڑی تعداد میں غیر مسلموں نے بھی خراج عقیدت پیش کیا۔

ان کے انتقال پر وکلاء برادری میں بھی سوگ کی فضا چھائی رہی۔ مہنداول، خلیل آباد اور دھنگھٹا کی عدالتوں میں ایک ہفتے کا سوگ منایا گیا۔ پورے ایک ہفتے ان عدالتوں میں کام کاج ٹھپ رہا۔ ایسے کئی موکل تھے جو ان کی میت کے پاس پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

کورٹ میں عزت و وقار کے علاوہ ان کا بڑا دبدبہ بھی تھا۔ وہ قانونی باریکیوں سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور مقدموں کی نظیروں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انگریزی کی معلومات ہونے کی وجہ سے وہ مخالفین پر بھاری پڑ جاتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ بحث کے دوران ان کے مخالف وکلاء ان پر زور ڈالتے کہ وہ انگریزی نہیں بولیں گے صرف ہندی میں بحث کریں گے۔ اس پر وہ کہتے کہ اگر تم لوگ میری ہندی بھی نہیں سمجھ پائے تو کیا ہوگا۔

حماد انجم ایڈوکیٹ قانونی نکتوں کے علاوہ مذہبی امور پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کو مسلکی امور اور فقہی مسائل کی خاصی معلومات تھیں۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ لوگ مذہبی و مسلکی معاملات میں ان کی رائے جاننے کی کوشش کرتے۔ مذہبی کتابوں کا مطالعہ انھوں نے طالب علمی

کے زمانے سے ہی شروع کر دیا تھا۔ جب وہ ایل ایل بی کر رہے تھے تو ایک چھٹ بھیا مولوی ہمارے گاؤں میں کسی کا مہمان ہوا۔ اتفاق سے دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ مذہبی و مسلکی گفتگو ہونے لگی۔ آخر میں جھنجھلا کر مذکورہ مولوی نے ان سے سوال کیا:

''کیا آپ کو نماز جنازہ کی دعا یاد ہے''۔اس نے اپنی دانست میں بہت بڑا تیر مارا تھا۔

حماد بھائی نے برجستہ کہا:''میں تمھارے پورے خاندان کی نماز جنازہ پڑھا سکتا ہوں، پہلے تم مرو تو سہی''۔

کسی مسئلے پر بحث کے دوران وہ اپنے علاوہ کسی کی دلیل سننے کو تیار نہیں ہوتے۔

ایک واقعہ بہت مشہور ہوا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ غالباً ایل ایل بی کر رہے تھے یا انھوں نے وکالت شروع کی تھی۔ ایک بار جمعہ کے روز گاؤں کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینے اور نماز پڑھانے کے لیے کوئی مولوی صاحب موجود نہیں تھے۔ جن کو خطبہ دینا تھا وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ جب وقت گزرنے لگا تو مصلیوں نے ان کی مذہبی معلومات کے پیش نظر ان سے کہا کہ وکیل صاحب آج آپ کو خطبہ جمعہ بھی دینا پڑے گا اور نماز بھی پڑھانی پڑے گی۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ پیشے سے ایک وکیل منبر رسول پر چڑھ گیا۔

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

انھوں نے ایک مولانا کے انداز میں خطبہ بھی دیا اور نماز کی امامت بھی کی۔ امامت تو ان کو اکثر کرنی پڑتی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اہلحدیث مسلک کی مسجدوں میں کتاب دیکھ کر خطبہ نہیں پڑھا جاتا۔ زبانی خطبہ دیا جاتا ہے اور عربی کے دونوں خطبوں کے درمیان اپنی زبان میں سماجی و اسلامی مسائل پر کم از کم نصف گھنٹے تک تقریر بھی کرنی پڑتی ہے۔ انھوں نے کسی منجھے ہوئے خطیب کی مانند خطبہ دیا۔ گویا:

لاکھ نادان سہی ایسے بھی ہم کور نہیں......اور

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

ہم دونوں بھائیوں نے اگرچہ انگریزی اسکولوں میں تعلیم پائی ہے لیکن والدین کی تربیت نے ہم لوگوں کے اندر کچھ نہ کچھ دینی جذبہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ حماد بھائی کے چہرے

مہرے کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مولانا نہیں ہیں۔ حالانکہ بعض مولانا حضرات کی مانند ان کی داڑھی لمبی نہیں تھی۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی ریش مبارک پر ایک بار بھی استرا نہیں چلوایا تھا۔

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ انھوں نے ایل ایل بی کی ڈگری ابھی ابھی حاصل کی تھی۔ ایک مذہبی شخص ہمارے گھر بطور مہمان آئے۔ انھوں نے ابا سے شکایت آمیز لہجے میں کہا:

''آپ نے اپنے بڑے بیٹے کو وکالت کی تعلیم دلوا کر بہت غلط کیا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وکلاء حضرات کس طرح جھوٹ کی فصل کاٹتے ہیں۔ ان کا مذہب سے تو کوئی لینا دینا ہی نہیں ہوتا۔ وکلاء کو تو شیطان کی اولاد کہا جاتا ہے''۔

ابا صبر اور خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب وہ چپ ہو گئے تو انھوں نے ان سے کہا: ''کیا آپ نے ابوالاثر کو دیکھا ہے''۔

انھوں نے کہا نہیں۔ ابا نے آواز دی۔ حماد بھائی گھر کے اندر سے باہر آئے۔ کرتا پائجامہ اور چہرے پر خوبصورت داڑھی۔ ابا نے کہا:

''یہی وہ وکیل ہے جس کے بارے میں آپ شکایتی لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں''۔

وہ آدمی بے انتہا شرمسار ہوا اور اس نے لجاجت کے ساتھ اپنے جملے واپس لے لیے۔

۲۷/اکتوبر ۲۰۱۴ کو حماد بھائی ناشتہ کر کے کورٹ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک دو تین خطرناک قسم کی چھینکیں آئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ آخری چھینک بہت تکلیف دہ تھی۔ ایسا لگا جیسے اندر سے کوئی چیز اوپر کی طرف لپیٹ دی گئی ہو۔ ان کو سانس لینے میں زبردست دشواری ہونے لگی۔

فوری طور پر انھیں گورکھپور لے جا کر پوروانچل اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ہوا یہ تھا کہ چھینک کی وجہ سے پھیپھڑے کے اوپر کی جھلی میں سوراخ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے جھلی اور پھیپھڑے کے درمیان کی خلا میں ہوا بھر گئی۔ ہوا کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ جھلی نیچے سے سکڑ کر اوپر جا کر چپک گئی۔ سانس لیتے تو سانس ادھر سے جاتی مگر واپس نہیں آتی بلکہ نیچے کی طرف نکل جاتی۔ جس کی وجہ سے مستقل ماسک لگائے رہنا پڑتا۔

پوروانچل اسپتال کے ڈاکٹر اقبال نے بائیں جانب سینے پر ایک ہلکا سا آپریشن

کر کے ایک پائپ پھیپھڑے کی طرف لگا دیا تا کہ ہوا باہر نکل آئے۔ کچھ افاقہ ہوا مگر کئی روز گزر جانے کے بعد جب مرض پر قابو پانا مشکل ہو گیا تو انھوں نے پی جی آئی (سنجے گاندھی پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ) لکھنؤ لے جانے کو کہا۔ دہلی کے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کی کل ہند پیمانے پر جو حیثیت ہے وہی حیثیت پی جی آئی کی یو پی کی سطح پر ہے۔

پی جی آئی میں بیڈ کی عدم دستیابی کی وجہ سے انھیں لکھنؤ کے ہی سہارا اسپتال میں ۸ نومبر کو صبح چھ بجے ایمر جنسی میں داخل کرایا گیا۔ اسپتال نے بیس ہزار روپے جمع کروائے اور چند گھنٹوں کے بعد انھیں سرجیکل آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا۔ لیکن وہاں بھی جب کسی افاقے کا امکان نظر نہیں آیا تو ان کا علاج کرنے والے ڈاکٹر ایس این گپتا نے مجھ سے کہا کہ یہ ۹۰ فیصد آپریشن کا کیس ہے۔ وہ آپریشن یہاں کوئی نہیں کر پائے گا۔ آپ انھیں دہلی لے جائیے۔ انھوں نے اس بارے میں ذاتی طور پر دلچسپی لی اور تین ڈاکٹروں کے نام اور نمبر دیے جو کہ دہلی میں فورٹیس، گنگا رام اور دلی ہارٹ اینڈ لنگ انسٹی ٹیوٹ پوسہ روڈ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ڈاکٹر سے بات بھی کی۔ لکھنؤ اور اس کے باہر کے کئی اور ڈاکٹروں سے بات ہوئی۔ سب نے اسے آپریشن کا کیس بتایا۔ اس دوران شہرت بھائی نے لکھنؤ میں ہمارے ساتھ رہ کر ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور حماد بھائی سے اپنی دوستی کا حق بھی ادا کیا۔

یہاں میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ لکھنؤ میں قیام کے دوران بزرگ صحافی جناب حفیظ نعمانی نے ہم لوگوں کی بڑی مدد کی۔ انھوں نے جس طرح اپنے ہوٹل ''ردا کانٹینٹل'' کے دروازے ہم لوگوں کے لیے کھول دیے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ بار بار بذریعہ فون خیریت بھی معلوم کرتے رہے۔ ان کی عنایتوں نے وہاں ہم لوگوں کو بڑا سہارا دیا۔

اس دوران بعض دوستوں اور کرم فرماؤں کے توسط سے پی جی آئی میں متعلقہ شعبے کے سربراہ ڈاکٹر اجمل سے رابطہ قائم رہا۔ ۱۱ نومبر کو جب ہم حماد بھائی کو دہلی لانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ڈاکٹر اجمل کا فون آیا۔ انھوں نے مریض کی رپورٹس دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ رپورٹس دیکھنے کے بعد انھوں نے بھی اسے ۹۰ فیصد آپریشن کا کیس بتایا۔ لیکن فوری طور پر مریض کو اپنے وارڈ میں داخل کر لیا۔

ادھر اسپارا اسپتال سے جب ۱۱ نومبر کو تین چار بجے شام کو انھیں ڈسچارج کروا کر حساب کتاب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک یعنی ساڑھے تین روز میں اس اسپتال نے ۲۷ ہزار روپے لے لیے ہیں۔ پی جی آئی کے ڈاکٹر اجمل نے جب انھیں دیکھا تو فوراً کہا کہ آپریشن غلط جگہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے چند سینٹی میٹر دور آپریشن کروا کر نلکی لگوا دی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ دوبارہ نلکی لگاتے ہی افاقہ شروع ہو گیا۔ حماد بھائی کے مطابق ایسا لگا کہ جیسے کوئی مچھلی تڑپ کر پلٹ گئی ہو۔ یعنی وہ جھلی جو سکڑ کر اوپر کی طرف مڑ گئی تھی، نیچے آنے کا نام نہیں لے رہی تھی، پھیلنے لگی۔ جسے دیکھ کر علاج کرنے والے ڈاکٹروں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ یہ تو 'چمتکار' ہو گیا۔ جو بات ناممکن تھی وہ ممکن ہو گئی۔

ڈاکٹروں کو بتایا گیا کہ دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں کے ذریعے یہاں سے لے کر خانہ کعبہ اور مسجد نبوی تک میں دعائیں ہوئی ہیں چمتکار تو ہونا ہی تھا۔ اس واقعہ نے دعاؤں میں اثر کا بڑا جیتا جاگتا نمونہ پیش کیا۔ انہی کے اشعار ہیں:

یہ کارگہ شیشہ گری بھی تو ہے تیری
آئینہ بھی آئینہ گری بھی تو ہے تیری
بیمار بھی تیرے ہیں مداوا بھی ترا ہے
چارہ بھی ترا چارہ گری بھی تو ہے تیری

بہر حال گیارہویں مہینے کی گیارہ تاریخ کو گیارہ نمبر کے بیڈ پر ایڈمٹ ہونے والے حماد انجم جب گیارہ روز گزار کر وہاں سے ڈسچارج ہوئے تو بالکل شفایاب ہو کر۔ یہ بھی بتاتے چلیں کہ وہاں صرف ۲۲ ہزار روپے خرچ ہوئے۔

اس درمیان دوائیں چل رہی تھیں اور مارچ میں ان کو دوبارہ چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ لیکن آٹھ فروری ۲۰۱۴ کو عصر بعد ان کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔ حالانکہ اس کی انھیں کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ انھوں نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے دوائیں دیں اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن دوا بے اثر رہی۔ قضا و قدر نے تو کچھ اور ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ بلڈ پریشر بڑھتا گیا اور عشا کی نماز سے عین قبل دل کا شدید دورہ پڑا۔ کہیں لے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ انھوں نے

خود اہل خانہ سے کہا کہ مجھے کہیں مت لے جایئے بس اب میں کچھ دیر کا مہمان ہوں۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر ان کی روح پرواز کر گئی۔ قصہ تمام ہو گیا۔

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

حماد بھائی تیز مزاج کے تھے۔ کوئی بات پسند نہیں آتی تو برجستہ ردعمل ظاہر کرتے۔ کسی کو بھی خواہ وہ کوئی بھی ہو ڈانٹ دیتے۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اسے برا لگے گا یا بھلا۔ کسی نہ کسی بات پر مجھے بھی سخت سست کہتے رہتے۔ لیکن جانے کیا وجہ رہی کہ میں ان کی کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دے پاتا۔ بعد میں سوچتا کہ مجھے کچھ تو بولنا چاہیے تھا۔ لیکن جب بھی ایسا کوئی موقع آتا میرے ہونٹ سی اٹھتے۔ فروری ۲۰۱۳ میں ابا کے انتقال کے بعد ان کے رویے میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ ہم لوگوں کی غلطی پر بھی خاموش رہتے۔ کوئی شخص کسی کے بارے میں شکایت کرتا تو بولتے جانے دو کوئی بات نہیں۔ ارے سب اپنے ہی ہیں۔

ضرورت مندوں کی مدد کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ ایسے لوگوں کی وہ خاموشی کے ساتھ اعانت کرتے۔ گاؤں میں بیشتر لوگ اپنے اہم کاموں کے لیے انہی کو زحمت دیتے۔ وہ بھی فوراً حاضر۔ کورٹ میں زیادہ کام نہیں ہے تو کورٹ جانا منسوخ۔ خوشگوار تعلقات تو سبھی سے تھے لیکن دوستی محض چند لوگوں کے ساتھ تھی۔

ان کے اندر عبادت گزاری کا رجحان بھی بڑھ گیا تھا۔ یوں تو وہ پنج وقتہ نمازی رہے ہیں۔ لیکن اب اور پابندی ہو گئی۔ قرآن مجید ایک عرصے سے ترجمہ کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ انھوں نے بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا تھا۔ حاشیے پر جگہ جگہ یادداشتیں تحریر کرتے۔ قرآن مجید کے اس نسخے کے حاشیے پر جگہ جگہ کچھ نہ کچھ لکھا ہوا ہے۔

وہ مجھ سے صرف دو سال بڑے تھے۔ لیکن علم، تجربہ، معلومات اور دوسرے بہت سے معاملات میں بہت آگے تھے۔

بیماری کے بعد ان کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ کچھ بجھے بجھے بھی رہنے لگے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں:

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ان کی بیماری کے بعد جانے کیوں مجھے ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ ۸ فروری ۲۰۱۵ کو میں جماعت اسلامی ہند کے صدر دفتر واقع ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی میں شام کے وقت ایک میڈیا ورکشاپ میں شرکت کرنے کے بعد میں مہمانوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ پہلے حماد بھائی کے فون سے کال آئی جو میں اٹینڈ نہیں کر سکا۔ چند لمحوں کے بعد گھر سے میری اہلیہ نے فون کیا۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ کہاں ہیں۔ میں نے بتایا کہ بس نکلنے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ گھر سے بہت بری خبر ہے۔ فوری طور پر میرا ذہن حماد بھائی کی طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے پوچھا کیا ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ بھیا کا انتقال ہو گیا۔

ایسا لگا جیسے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سر کے اوپر سے چھت اڑ گئی۔

اے خدا غیب سے کچھ حوصلہ افزائی کر

ان کا چھوٹا بیٹا اور میرا بھتیجہ اختر الایمان جو کہ پونے میں تھا وہ بھی ہماری مانند بذریعہ طیارہ لکھنؤ پہنچا۔ ہم لوگ نماز مغرب سے نصف گھنٹہ قبل اپنے گاؤں پہنچے اور پھر فوری طور پر نماز جنازہ اور تدفین کا مرحلہ مکمل ہوا۔

ان کے اس ناگہانی انتقال سے پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔ ہر جگہ انہی کا چرچا، ہر جگہ انہی کی گفتگو۔

میں ایک ہفتہ گزار کر دہلی واپس آ گیا۔ میری اہلیہ وہیں رک گئیں تا کہ بھابھی کے ساتھ کچھ وقت گزار سکیں۔ انھیں تسلی دے سکیں۔ وہ یکم مارچ کو دہلی آئیں۔

۱۳ فروری سے یکم مارچ تک جو مجھے دہلی میں اہلیہ کے بغیر زندگی گزارنی پڑی تو یوں لگا کہ یہ میرے لیے خود احتسابی کا ایک موقع ہے۔ میں دنیا کی بے وقعتی اور اس کی بے ثباتی پر گھنٹوں

غور کرتا اور اس نتیجے پر پہنچتا کہ سب بیکار ہے۔ دنیا سے دل لگانا کارِ حماقت ہے۔ اللہ نے ہمیں جو موقع دیا ہے اس کا بہتر استعمال ہونا چاہیے۔ جو ذمہ داریاں سر پر ہیں وہ ایمانداری کے ساتھ اور فوری طور پر ادا کر دی جانی چاہئیں۔ یہ بھی خیال آتا کہ اس تنہائی کی زندگی کو ایک ریہرسل اور ایک پریکٹس کے طور پر لینا چاہیے۔ پتہ نہیں کب کس کا چل چلاؤ ہو جائے۔

یہ متاعِ ظلمت شب رائیگاں ہونے کو ہے
رات کا پچھلا پہر ہے اب اذاں ہونے کو ہے

(حماد انجم)

اس کے ساتھ ہی دنیا سے بے رغبتی بڑھ گئی۔ خوشیاں پرائے دیس کی باسی ہو گئیں۔ نہاں خانۂ دل اداسیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ زندگی بے کیف ہو گئی۔ بس کسی طرح خود کو مصروف رکھ کر اس بے کیفی کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

ہجوم یاس سے گھبرا گیا ہوں
مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

☆☆

محمود الحسن انصاری

(اردو کا عاشق، ملت کا شیدا)

۲۵ جنوری ۲۰۱۵ کو جب محمود الحسن بھائی کے انتقال کی خبر ملی تو مجھ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ ابھی نومبر ہی میں ان کے والد جناب قربان علی کا انتقال ہوا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں میں اپنے وطن میں تھا۔ میں ان کے گھر گیا۔ تدفین کے بعد بھی دیر تک انہی کے ساتھ رہا۔ ان کے والد تقریباً بیس سال سے صاحب فراش تھے۔ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد ان کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ اس عرصے میں ان کے بچوں نے جس طرح ان کی خدمت کی وہ سعادت مندی کی عمدہ مثال ہے۔

چھریرے بدن اور وجیہ پرسنالٹی والے محمود الحسن بھی سال دو سال سے بیمار تھے۔ ان کی بھی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب ان کی بینائی واپس نہیں آسکتی۔ بلڈ پریشر اور شوگر میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کم از کم دن میں چلتے پھرتے تھے اور عزیزوں اور رشتے داروں کے یہاں بھی آمد و رفت رکھتے۔ اس کی امید قطعی نہیں تھی کہ وہ اتنی جلد اس دنیا کو خیر باد کہہ دیں گے۔ لیکن بہر حال بلڈ پریشر اور شوگر کی زیادتی نے ان کے دل پر حملہ کیا اور وہ دل کے دورے سے جاں بر نہ ہو سکے۔

محمود الحسن کو ان کے قریبی محموڈل کہا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں کرنجوت بازار (ضلع سنت کبیر نگر اتر پردیش) میں ان کی سسرال ہے۔ لیکن ہم لوگوں سے ان کا تعلق اس رشتے کے

علاوہ بھی تھا اور بہت قریبی تھا۔ وہ ہمارے بڑے بھائی جناب حماد انجم کے گہرے دوست تھے اور مجھے چھوٹے بھائی کی مانند جانتے مانتے تھے۔ بعد میں ہماری بھانجی شمامہ کی ان کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد آصف کے ساتھ شادی ہوگئی۔ اس رشتے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہم لوگوں کا رشتہ اور قریبی ہونے کے ساتھ ساتھ اور مضبوط ہوگیا۔ اب جبکہ وہ اس دنیا کو خیر باد کہہ چکے ہیں، بہت سی باتیں یاد آتی ہیں اور تڑپا جاتی ہیں۔ مجھے اس کا تو ہوش نہیں کہ میں کب سے ان کو جانتا تھا، ہاں شائد بچپن سے۔ لیکن اتنا تو یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا کہ میں نے انھیں ہمیشہ یکساں پایا۔ وہی محبت، وہی اپنائیت، وہی شفقت، وہی خلوص اور وہی خورد نوازی۔ انتہائی شریف النفس اور ہر کس و ناکس سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا اور ہر شخص کو حسب مراتب مقام دینا ان کے مزاج میں شامل تھا۔ انھوں نے ہمارے گاؤں میں ایک عرصہ گزارا تھا۔ اس وقت وہ وہاں سوت کی رنگائی کا کام کرتے تھے اور سب سے ان کا ملنا جلنا تھا۔ ہمارے گاؤں میں شائد ہی کوئی ایسا ہو جو ان سے کبھی بدگمان ہوا ہو یا جس سے ان کی کبھی تلخ کلامی ہوئی ہو۔

دنیا کی کسی چیز کو بھی دل میں نہ رکھا

ان کی تعلیم بس واجبی سی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے مطالعہ، اردو زبان و ادب سے دلچسپی اور دینی مزاج کی وجہ سے تعلیم یافتہ حلقوں میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی۔ شعر و ادب سے ان کو خاص شغف تھا۔ مجھے یاد آتا ہے یہ ان کی جوانی کے ایام تھے۔ انھوں نے اپنے وطن امرڈوبھا ضلع سنت کبیر نگر کے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر آل انڈیا مشاعرے کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں مشاعروں کے اہتمام میں زیادہ خرچ نہیں آتا تھا۔ مشہور و مقبول شعرا بھی سات آٹھ سو روپے میں مشاعرہ پڑھنے آجاتے تھے۔ نہ تو مہنگائی زیادہ تھی اور نہ ہی شعرا کے معاوضے۔ انھوں نے کچھ مخیر حضرات سے مل کر اور کچھ اپنے حلقے میں چندہ کر کے ایک آل انڈیا مشاعرے کا اعلان کر دیا۔ اس میں ساغر اعظمی، بشیر بدر، ترنم کانپوری، عمر قریشی، نور اندوری اور بہت سے شعرا نے شرکت کی۔

مشاعرہ زبردست کامیاب رہا۔ پھر تو ان کے حوصلے بلند ہوگئے۔ انھوں نے آئندہ سال بھی آل انڈیا مشاعرہ کیا۔ یہ سلسلہ کئی برسوں تک چلا۔ میں نے وہیں پر پہلی بار ثقلین حیدر اور

انور جلالپوری کی نظامت دیکھی اور سنی۔ مرحوم ثقلین حیدر کا انداز انور جلال پوری اور ملک زادہ منظور احمد سے یکسر جدا تھا۔ وہ انتہائی برق رفتاری کے ساتھ بولتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی طوفان ہے جو سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے کر آسودہ ہو جانا چاہتا ہے۔ ناظم حضرات سامعین کی دلچسپی کو قائم رکھنے کے لیے درمیان میں لطیفے بھی سناتے ہیں۔ وہ بھی لطیفے سناتے۔ لیکن اسی طوفانی انداز میں۔ اور لطیفہ ختم ہوتے ہی اس شاعر کو پکار لیتے جس کو پڑھوانے کے بارے میں انھوں نے سوچ کے رکھا ہوتا۔

یہ ۷۰ کی دہائی کی بات ہے۔ ان مشاعروں نے جہاں محموڈل کو معاشرے میں ایک باوقار مقام دلا دیا وہیں اس خطے میں شعر و شاعری کا چرچا بھی ہونے لگا اور زوروں سے ہونے لگا۔ اردو داں طبقے میں مشاعروں کے تعلق سے دلچسپی پیدا ہونے لگی جو دیکھتے دیکھتے ایک مہم کی شکل اختیار کر گئی۔ ان کے دیکھا دیکھی دوسرے قصبوں اور مواضعات میں بھی مشاعروں کا اہتمام ہونے لگا۔ لیکن شائقین اور سامعین کو امرڈوبھا کے سالانہ مشاعرے کا انتظار رہتا۔ انھوں نے برسوں تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے شعرا میں بھی ان کی قدر بڑھ گئی۔ بہت سے لوگ جو اپنے علاقے میں مشاعرے کرواتے وہ ان سے مشورہ کرتے اور شعرا کو بلانے میں ان کا تعاون بھی حاصل کرتے۔ ہمارے گاؤں سے امرڈوبھا کی مسافت تقریباً دس کلومیٹر ہے۔ ہم نوجوانوں کا طبقہ سائیکل سے مشاعرہ سننے جاتا اور رات ہی رات میں واپس آ جاتا۔ ان مشاعروں نے اردو داں حلقوں میں ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ سامعین بیسیوں کلومیٹر دور ہونے والے مشاعروں میں بھی بذریعہ سائیکل شرکت کرتے۔ ان دنوں موٹر سائیکل کا وہ چلن نہیں تھا جو اب ہے۔

ان مشاعروں نے بچوں میں بھی شعر خوانی کا زبردست جذبہ پیدا کیا تھا۔ یہاں تک کہ اسکولوں اور مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بہت سے اسٹوڈنٹس اور طلبہ مشہور شعرا کی نقالی کرتے اور جگہ جگہ غزلیں سنا کر داد و تحسین حاصل کرتے۔ ایسے ہی ایک تمثیلی مشاعرے کا اہتمام ہم لوگوں نے اپنے گاؤں میں کیا تھا۔ جس میں کوئی بشیر بدر بنا تھا تو کوئی ساغر اعظمی، کوئی شعلہ ٹانڈوی تو کوئی ترنم کانپوری اور کوئی نور اندوری۔ ہم لوگوں نے ہاتھ سے دس بیس پوسٹر لکھے اور جگہ جگہ چائے کے ہوٹلوں میں چسپاں کر دیے۔ دو لڑکوں کو رکشے پر بٹھا کر لاؤڈ اسپیکر سے قرب و

جوار میں اعلان کروادیا۔ وہ تمثیلی مشاعرہ خوب کامیاب رہا۔ ان دنوں راقم الحروف بھی مشق سخن کیا کرتا تھا۔ اس مشاعرے میں صرف دو اوریجنل شاعر تھے۔ حماد بھائی اور خاکسار۔ باقی سب متشاعر اور نقال تھے۔ لیکن ایک تو اعلان اور دوسرے لوگوں کا جذبہ، سامعین کھنچ کے مشاعرہ گاہ تک آگئے تھے۔

ان دنوں جب بھی امرڈوبھا میں مشاعرے کے علاوہ کوئی مذہبی جلسہ بھی ہوتا تو ہم لوگ وہاں ضرور جاتے اور محمود ل بھائی کے مہمان ہوتے۔ وہ ہم لوگوں کی زبردست مہمان نوازی کرتے۔ ان کے والد بھی جنھیں ہم لوگ خالو کہتے تھے ہم لوگوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ انھی دنوں دو بھائیوں عاشق علی اور شاکر علی نے جو کہ محمودل بھائی کے دوست تھے، اس تراہے پر جہاں سے ایک سڑک مہنداول کی طرف جاتی ہے اور دوسری نندور کی طرف، چائے کا ایک ہوٹل کھولا جس کا نام انھوں نے "شالیمار ہوٹل" رکھا۔ وہ ہوٹل محمودل بھائی کی وجہ سے ہم لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ جب امرڈوبھا جانا ہوتا تب بھی، یا جب کبھی خلیل آباد یا گورکھپور جاتے اور وہاں سے واپس آتے تب بھی اس ہوٹل پر رکنا ایک ناگزیر معمول بن گیا تھا۔ دونوں بھائی بھی ہم لوگوں کی بڑی عزت کرتے اور محبت آمیز انداز میں پیش آتے۔ ان دنوں میں ممبئی کے ہفتہ وار اخبار "بلٹز" اور دہلی کے ہفت روزہ "اخبار نو" کے لیے نمائندگی کرتا تھا۔ اس وجہ سے بھی وہاں اٹھنا بیٹھنا ہوتا۔ وہ ہوٹل ایک طرح سے ادبی وصحافتی سرگرمیوں کی پلاننگ کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ اب وہ ہوٹل دونوں بھائیوں میں بٹ گیا ہے اور وہ پہلے جیسی بات بھی اب نہیں رہ گئی۔ وہاں اور بھی کئی ہوٹل کھل گئے۔ لیکن جو شہرت اور عزت شالیمار ہوٹل کو ملی تھی وہ کسی اور ہوٹل کے نصیب میں نہیں آئی۔

محمودل بھائی کے اندر ملی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کوئی مسلمان کسی بھی میدان میں آگے بڑھتا خواہ وہ ہندوستان کا ہو یا کسی دوسرے ملک کا، ان کو دلی طور پر بڑی خوشی ہوتی۔ اسی ملی رشتے اور تعلق کی وجہ سے وہ بالی ووڈ میں شہنشاہ جذبات دلیپ کمار، آواز کے جادوگر محمد رفیع، موسیقار نوشاد، نغمہ نگار شکیل بدایونی اور ساحر لدھیانوی اور کھلاڑیوں میں سید کرمانی، سید مودی اور عالمی شہرت یافتہ باکسر محمد علی کلے اور عالمی سیاست دانوں میں یاسر عرفات،

کرنل قذافی، ذوالفقار علی بھٹواور صدام حسین کے زبردست مداح بلکہ عقیدت مند تھے۔محمد رفیع کے انتقال کی خبرانھوں نے ہی ریڈیو پر سننے کے بعد مجھے دی تھی۔جب سید مودی کا قتل ہوا توان پر بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔وہ اکثر کہا کرتے کہ فلمی دنیا مسلمانوں کے دم پر زندہ ہے۔اگر دلیپ کمار، محمد رفیع، نوشاد، شکیل بدایونی اور ساحرلدھیانوی فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیں تو بالی ووڈ دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا۔

وہ ایک وسیع القلب انسان تھے۔غیر مسلم باصلاحیت شخصیات کی بھی اتنی ہی قدر کرتے جتنی کہ مسلم شخصیات کی۔اس تعلق سے وہ سیاست دانوں میں ہیم وتی نند بہوگنا، راج نرائن، وی پی سنگھ، چودھری چرن سنگھ اور دیوی لال کے بڑے قدردان تھے۔علاقے کے اہم اور سرکردہ غیر مسلم شخصیات سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔

وہ بڑی پابندی کے ساتھ اردو اخباروں کا مطالعہ کرتے اوران میں مذکورہ شخصیات کے علاوہ دوسری اہم شخصیات کے بارے میں جو کچھ بھی چھپتا اسے بڑی دلچسپی سے پڑھتے اور ناخواندہ لوگوں کو پڑھ کرسناتے بھی۔اخبارات خرید کر پڑھنا ان کا شیوہ تھا۔ان کے ہاتھ میں اکثر کوئی نہ کوئی اخبار یارسالہ ہوا کرتا تھا۔خواہ وہ قومی آواز ہو یا نئی دنیا، اخبارنو ہو یا بلٹز۔اسی طرح بیسویں صدی، روبی اور دوسرے رسائل وجرائد بھی میں اکثران کے ہاتھ میں دیکھتا۔وہ مانگ کر اخبار پڑھنے والوں سے بہت چڑتے تھے۔وہ ابن صفی، نسیم حجازی اور صادق سردھنوی کے بھی بہت بڑے عقیدت مند تھے۔کم عمری ہی میں انھوں نے ان ناول نگاروں کے بیشتر ناول پڑھ ڈالے تھے۔ان کی ترغیب اور تحریک پر ہم لوگوں نے بھی ابن صفی، نسیم حجازی اور صادق سردھنوی وغیرہ کے کئی ناول بچپن ہی میں پڑھ ڈالے۔اس ادب نوازی کا ہمارے گاؤں کے نوجوانوں پر بھی اچھا اثر پڑا تھا۔

ہم کئی نوجوانوں نے مل کر اپنے ہی گاؤں کے بازار میں ایک لائبریری بھی کھول لی تھیں جس میں پرانے ناولوں کے علاوہ ہر نئے ناول کو رکھنے کی روایت شروع ہوئی تھی۔نوجوان طلبہ اور اسٹوڈنٹس کو ہم لوگ زبردستی دے دے کر ناول اور دوسری کتابیں پڑھواتے۔پھر کسی وجہ سے وہ لائبریری بند ہوگئی۔محمود ل بھائی اردو زبان کے سچے عاشق تھے اوراگر اردو کے ساتھ کسی

بھی قسم کی ناانصافی دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔ کبھی کبھی مشق سخن بھی کرتے۔ لیکن یہ بات زیادہ لوگوں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ انھوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس میدان میں ہاتھ نہیں آزمایا ورنہ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہو سکتے تھے۔

منزل دار و رسن مجھ سے کبھی دور نہ تھی

میں جب بغرض ملازمت دہلی آیا اور اخبار نو میں کام کرنے لگا تو وہ بعض اوقات امرڈوبھا سے بنکروں کے مسائل پر کوئی رپورٹ بنا کر بھیجتے۔ انھی دنوں میں جب میں ایک بار اپنے وطن گیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے میرا وزیٹنگ کارڈ مانگا۔ جب میں نے ایک دیا تو کہنے لگے:

''ارے سہیل ایک ہی کیوں دے رہے ہو اور دو نا''۔

میں نے کہا کہ اور کیا کریں گے؟ کہنے لگے:

''میں اسے جیب میں رکھوں گا اور لوگوں کو دکھاؤں گا کہ دیکھو سہیل اب دہلی میں اخبار میں کام کرتے ہیں اور بہت بڑے صحافی ہو گئے ہیں''۔

حالانکہ میں جانتا تھا کہ میں کیا ہوں۔ من آنم کہ من دانم۔ لیکن چھوٹی جگہوں پر چھوٹا موٹا صحافی بھی کسی بڑے ایڈیٹر سے کم رتبہ نہیں رکھتا۔

میں نے ان کو پانچ سات کارڈ دے دیے۔ اتفاق سے جب میں دہلی چلا آیا تو اس کے کچھ دنوں کے بعد امرڈوبھا کے قریب ایک گاؤں میں فساد ہو گیا۔ محمود دل بھائی نے اسی روز بذریعہ سائیکل وہاں کا دورہ کیا اور ایک رپورٹ بنا کر اخبار نو کو بھیجی۔ کچھ دنوں کے بعد جب میں پھر وطن گیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو اس فساد کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو کہنے لگے:

''ارے تمھارے دیے ہوئے وزیٹنگ کارڈ نے بڑا کام کیا''۔

میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ کہنے لگے:

''جب میں نے سنا کہ فلاں گاؤں میں فساد ہو گیا ہے تو میں بے چین ہو گیا اور وہاں جانے کے بارے میں سوچنے لگا تا کہ مظلوموں کی خیریت لے سکوں۔ میں نے سائیکل اٹھائی اور

ڈرتے ڈرتے اس گاؤں کی طرف بڑھا۔ مغرب کی نماز کے بعد میں اس گاؤں میں پہنچا۔ چاروں طرف تاریکی اور پولیس کا پہرہ تھا۔ میں خوف زدہ بھی تھا مگر ہمت کر کے اور چھپتے چھپاتے آگے بڑھ بھی رہا تھا۔ میں نے وہاں لوگوں کے جلے ہوئے گھر دیکھے اور تباہی و بربادی کا نقشہ دیکھا۔ کچھ لوگوں سے بات بھی کی۔ اتفاق سے کوئی پولیس والا مجھے نہیں دیکھ سکا اور میں اس گاؤں کا دورہ کر کے واپس آگیا''۔

میں نے پوچھا کہ آپ خوف زدہ تھے تو پھر کیسے گاؤں میں سائیکل لے کر گھومتے رہے۔ اگر پولیس والوں نے آپ کو پکڑ لیا ہوتا تو کیا ہوتا؟

انھوں نے کہا: ''تم نے اپنا جو وزیٹنگ کارڈ دیا تھا وہ میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس کارڈ نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے جیب میں کوئی کارڈ نہیں بلکہ اپنے تحفظ کا کوئی سامان رکھ لیا ہے۔ مجھے اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ میرے پاس متاثرہ گاؤں میں جانے کا کوئی جواز تو ہے۔ اس کارڈ کی وجہ سے میں وہاں کا دورہ کر سکا تھا''۔

میں نے پوچھا کہ اگر پولیس والوں نے پکڑ لیا ہوتا تو کیا کہتے:

کہنے لگے کہ میں وہی کارڈ دکھا دیتا اور کہتا کہ میرا نام سہیل انجم ہے اور میں پریس رپورٹر ہوں، فساد کی کوریج کے لیے آیا ہوں۔

مجھے اچھا بھی لگا، حیرت بھی ہوئی اور یہ احساس بھی ہوا کہ اگر آدمی کے اندر ہمت اور حوصلہ ہو تو معمولی سہارے سے بھی بڑے بڑے کام نکالے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ ہے۔ حالات بدل گئے زمانہ بدل گیا۔ محمودل بھائی کا رنگائی کا کام ٹھپ ہو گیا۔ ذریعہ معاش ختم ہو گیا۔ تلاش معاش نے ان کو بھیونڈی تک دوڑایا جہاں وہ دس بارہ سال تک پاور لوم چلا کر اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالتے رہے۔ میں دہلی سے کبھی کبھار گھر جاتا مگر چونکہ وہ بھیونڈی ہوتے اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔

برسوں گزر گئے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ دس سال قبل اہل و عیال کے ساتھ وطن واپس آگئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کے علاوہ سارے بیٹوں کی شادی کر دی تھی۔ سب اپنی فیملی کے ساتھ الگ الگ رہنے لگے، کوئی کہیں تو کوئی کہیں۔ تغیرات نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ ان کے

اپنے حالات بھی بدل گئے اور ان کا پرانا گھر بھی ٹوٹ کر نیا بن گیا۔ نکاسی جنوب سے شمال کی طرف ہوگئی۔ دیکھا جائے تو سب کچھ تلپٹ ہو گیا۔

برسوں کے بعد جب ان سے ملاقات ہوئی اور ان کے نئے گھر میں گئے تو ایسا لگا جیسے ان سے اب ایک نیا رشتہ جڑ گیا ہے۔ پرانا رشتہ وقت کی گرد میں دب گیا۔ نیا باب کھل گیا۔ نئے شب و روز آگئے۔ تقریباً دو سال قبل ہماری بھانجی کا ان کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد آصف کے ساتھ رشتہ طے ہو گیا۔ شادی میں ہم لوگ بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد تو ملاقاتوں کا سلسلہ ایک بار پھر چل پڑا۔

حالات کی اس نئی کروٹ نے واقعی ہم لوگوں کے درمیان ایک نیا تعلق قائم کر دیا۔ ایسا لگتا جیسے ان دو زمانوں کے درمیان ایک سرحد تھی جسے عبور کر کے ہم دوسری طرف آگئے ہیں۔ اگر چہ پہلے والا رشتہ بھی بہت مضبوط تھا مگر اب لگتا کہ یہ رشتہ زیادہ مستحکم ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو پہلے والے تعلق کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں خلوص اور جذبات کے سوا کسی اور چیز کو دخل نہیں تھا۔ اور اب جو تعلق قائم ہوا اس میں خلوص اور لگاؤ کے ساتھ ساتھ رشتے داری کا نازک عنصر بھی شامل ہو گیا۔

اسی سال اکتوبر میں جب عید الاضحیٰ کے موقع پر میں اپنے وطن گیا تو واپسی پر میں نے بنکروں کی بدحالی پر ایک کالم لکھا جو روزنامہ انقلاب سمیت کئی اخباروں میں شائع ہوا۔ دراصل اس کالم کے محرک وہی تھے۔ انھوں نے مجھے یاد دلایا کہ سہیل! تم نے پہلے بھی بنکروں کے مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے اب پھر لکھو۔ بنکروں کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہے۔ ان کی فرمائش پر میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ کئی لوگوں سے بات کی۔ انھوں نے بھی کئی لوگوں سے گفتگو کروائی اور پھر بہت سی ایسی باتیں بتائیں جو چونکانے والی تھیں۔ جب مضمون شائع ہوا تو انھوں نے اسے کسی بچے سے پڑھوا کر سنا اور بہت خوش ہوئے۔

بینائی چلی جانے کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے تھے۔ اس لیے ضروری مضامین اور خبریں وہ کسی سے پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے۔ اس موقع پر ان کے مکان کے سامنے محمد اسحٰق انصاری کے کارخانے میں ان کے ساتھ پاور لوم کی چند تصویریں کھینچیں جو دوسرے اخباروں میں مضمون کے ساتھ شائع ہوئیں۔ کسی اخبار میں بہت دنوں کے بعد ان کی تصویر کی اشاعت ہوئی تھی جو آخری

ثابت ہوئی۔

میرا ایک کالم جس کا عنوان تھا "گنگا رام کا پیسہ اور حیات محمد کا جج" بہت مقبول ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ سعودی عرب سے فلاں صاحب نے اس کالم کے بارے میں جب بتایا تو میں اسے پڑھوا کر سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔ بہر حال میں نے ادھر ادھر سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اخبار حاصل کیا اور پڑھوا کر سنا۔ اس کے بعد جب بھی گفتگو ہوتی تو اس کالم کا ذکر ضرور کرتے۔

ادھر دو تین برسوں میں ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ مجبور ہو کر مجھے بار بار اپنے وطن جانا پڑتا۔ جب بھی ان کو معلوم ہوتا کہ میں آیا ہوا ہوں، فون کرتے اور یہ اصرار کرتے کہ ہمارے گھر ضرور آنا ہے چاہے دہلی واپس ہوتے وقت آؤ۔ میں کوشش کرتا کہ ان کی خواہش ضرور پوری ہو۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وقت بہت کم تھا اور چند روز قبل میں اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر ان سے اور ان کے بچوں سے مل بھی آیا تھا۔ اس لیے ارادہ تھا کہ واپسی کے وقت ان کے گھر نہیں جانا ہے۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اگر تمھارے پاس وقت نہیں ہے تو کوئی بات نہیں کم از کم سڑک پر تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ جب ہم گاڑی سے اپنے گھر سے ٹرین پکڑنے کے لیے خلیل آباد جا رہے تھے تو انھوں نے فون کیا کہ ہم سڑک پر موجود ہیں۔ ایک منٹ کے لیے گاڑی روک لینا سلام دعا ہو جائے گی۔ ہم امرڈوبھا بابا روشن علی کے مزار کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ میاں بیوی سڑک کے کنارے کھڑے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا اور کوشش کرتا رہا کہ ان کے گھر جا کر ان سے ملاقات کروں۔

اسی جگہ ایک پان کی دکان ہے۔ دکاندار محمد بلال اردو اخباروں کے بڑے شائق ہیں۔ جب بھی کسی اخبار میں میرا کوئی مضمون شائع ہوتا تو وہ محمود ل بھائی کو بتا دیتے اور انھیں وہ اخبار بھی دے دیتے۔ کبھی کبھار وہ انھی سے پڑھوا کر سن بھی لیتے اور کبھی اپنے گھر لے جا کر کسی بچے سے پڑھواتے۔ محمد بلال کا اردو کے تعلق سے جذبہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ راشٹریہ سہارا اور انقلاب دونوں اخبار منگاتے ہیں۔ وہاں اردو کے یہی دو اخبار ملتے ہیں۔ انھوں نے ایک بار ان اخباروں کے بہت سے خصوصی شمارے، ہم لوگوں کو دکھائے اور محمودل بھائی سے کہا کہ انھیں لے جا کر اپنے گھر حفاظت کے ساتھ رکھ دو ورنہ یہاں ضائع ہو جائیں گے۔ اس واقعہ کے بعد میری نظروں میں بلال کی

وقعت بہت زیادہ بڑھ گئی۔اب بھی اس مٹتی ہوئی زبان کے چاہنے والے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔اور یہ میرا ایقان ہے کہ جب تک اردو سے محبت کرنے والے ایسے بے لوث اور مخلص افراد موجود ہیں اردو کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔

محمود دل بھائی کے اندر دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے کا بڑا زبردست جذبہ تھا۔وہ کسی کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتے تھے۔ان کے بس میں ہوتا تو کوشش کرتے کہ ہر ضرورت مند کی مدد کی جائے۔انھوں نے ایک واقعہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ پرچون کی کسی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چھوٹا سا بچہ اسٹیل کا ایک گلاس اور پانچ روپے لے کر آیا اور دکاندار سے پانچ روپے کا سرسوں کا تیل مانگا۔دکاندار نے منع کر دیا اور کہا کہ اتنے میں تیل نہیں ملتا اور پیسے لے کر آؤ۔بچے نے کہا کہ گھر میں اور پیسے نہیں ہیں۔محمود دل کے مطابق انھیں اس بچے پر بڑا ترس آیا اور انھوں نے دکاندار سے کہا کہ وہ بچے کو تیل دے دے۔اتنے میں نہیں جتنے میں آئے دے،باقی پیسے مجھ سے لے۔یہ واقعہ بتا کر کہنے لگے:

''سہیل! آج بھی جبکہ دنیا نے کتنی ترقی کر لی ہے اور لوگوں کے گھروں میں دولت آگئی ہے لیکن اب بھی ایسے گھر موجود ہیں جہاں بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا پکتا ہے۔مجھے اس بچے پر بڑا ترس آیا اور مجھ سے جو ہو سکا میں نے کیا''۔

محمود دل بھائی حسن پرست تھے لیکن ہوس پرست نہیں تھے۔وہ ہر شے میں اس کا حسن تلاش کر لیتے اور اس کی ستائش کرتے۔ان کے مطالعے کا معیار بہت بلند تھا۔شعر و شاعری کا ذوق بہت نکھرا ہوا تھا۔وہ ہر چیز اور ہر بات میں معیار کو اولیت دیتے۔آخری دنوں میں بیماری نے انھیں بہت مجبور کر دیا تھا۔ایک بار کہنے لگے کہ میں نے تمام پانچوں بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کر دی اب ایک اور بیٹی بچی ہوئی ہے اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو جاتا تو اطمینان ہو جاتا۔ہماری بھانجی سے محمد آصف کی شادی کے بعد اس کے سعودی عرب جانے کا پلان بنا۔مگر ممبئی کے ایک ایجنٹ نے ساٹھ ہزار روپے ہڑپ لیے اور کام بھی نہیں بنا۔اگر چہ اس واقعہ سے وہ بہت رنجیدہ تھے لیکن بہر حال کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے اور از سر نو پیسوں کا انتظام کر کے انھوں نے آصف کو بغرض ملازمت سعودی عرب بھیج دیا۔

وہ اپنے چھوٹے بھائی الطاف کو اپنے بیٹے کی مانند مانتے رہے ہیں اور الطاف نے بھی ان کو وہی درجہ دیا، کبھی ان کی کسی بات پر تعرض نہیں کیا۔

ان کی پوری زندگی جد و جہد اور کشمکش میں گزری۔ لیکن انھوں نے کبھی حالات کا شکوہ نہیں کیا۔ اپنے حال پر قناعت کرنا اور اپنے وسائل میں جینا ان کو خوب آتا تھا۔ پچھلے سال نومبر میں جب ان کے والد کے انتقال پر ان سے ملاقات ہوئی تھی تو کیا خبر تھی کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے اور اب صرف ان کی یادیں ہی باقی رہ جائیں گی۔ ابھی تو انھوں نے عمر کے ساٹھ سال بھی عبور نہیں کیے تھے اور ابھی چلے گئے۔

☆☆

محمد عمر پردھان

(تھوڑی شرافت زیادہ شرارت)

ان کا نام تو محمد عمر تھا مگر صدیقی برادری کی وجہ سے لوگ انھیں عمر میاں کہتے تھے۔ بعد میں وہ محمد عمر پردھان ہو گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پردھانی کا عہدہ منفعت بخش نہیں تھا۔ پھر بھی اس میں کچھ لوگوں کی دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ گاؤں میں بہت سی بنجر اور گرام سماج کی زمینیں ہوتیں جن پر گرام سبھا کا حق ہوتا۔ پردھان کو یہ اختیار تھا کہ وہ جس کے نام چاہے ان زمینوں کا پٹہ لکھ دے۔ اس کے علاوہ پردھان کی ایک پوزیشن ہوتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں ایک طویل عرصے تک نبیل بابا پردھان ہوتے رہے۔

ایک بار گاؤں کے لوگوں نے پردھان بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لوگوں کی نظر انتخاب عمر میاں پر گئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے۔ گاؤں کے معاملات سے دور دور رہتے۔ ان دنوں گاؤں میں اور علاقے میں بھی بجلی نہیں تھی۔ وہ بیٹری یعنی ٹارچ بنانے اور بیچنے کا کام کرتے تھے۔ اس وقت اس کی بڑی اہمیت تھی، آج بھی کچھ نہ کچھ ہے۔ روزانہ علاقے میں کسی نہ کسی گاؤں میں ہفتہ واری بازار لگتا۔ وہ ہر بازار میں جاتے۔ لوگوں کی پرانی بیٹری ٹھیک کرتے اور نئی بیٹری بیچتے۔ بس یہی ان کا کام تھا۔ ان کا بڑا بیٹا نورالحسن جسے سب نورو کہتے تھے ان کا ہاتھ بٹاتا۔ وہ بہت سے غریبوں کی بیٹری بغیر پیسے کے بھی بنا دیتے۔ مگر پیسے والوں سے کبھی کبھار زیادہ بھی وصول کر لیتے۔ ان کی شرافت اور اپنے کام سے کام رکھنے کی عادت کی وجہ

سے لوگوں نے انھیں پردھان بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ چار چھوٹے چھوٹے گاؤں اور جڑے ہوئے تھے۔ کم از کم سوسوا سو خاندانوں کا ہمارا گاؤں جن میں ۸۰ فیصد مسلمان اور بیس فیصد غیر مسلم۔ مسلمانوں میں بھی ۸۰ فیصد انصاری، باقی صدیقی اور تیلی، یا چند گھر درزیوں کے۔ باقی چاروں مواضعات دس دس بیس بیس گھروں پر مشتمل۔ ان میں اکثریت برہمنوں کی۔ ان کو ایک تو شروع میں پردھانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور دوسرے اگر ان میں سے کوئی کھڑا بھی ہوتا تو جیتنا مشکل ہو جاتا۔

بہر حال گاؤں کے کچھ معزز افراد عمر میاں کے پاس گئے۔ ان کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔ وہ خاموش رہے۔ لوگوں نے خاموشی نیم رضامندی کے تحت ان کا پرچہ بھروا دیا۔ لیکن جب کئی روز ہو گئے اور عمر میاں پرچار کے لیے گھر سے نہیں نکلے تو لوگوں کو تشویش ہوئی۔ لوگ جب ان کے گھر پہنچے تو منظر نامہ ہی بدلا ہوا تھا۔ پرچہ بھرنے کے بعد ان کی پوری شخصیت تبدیل ہو گئی تھی۔ ایک خاموش انقلاب آ گیا تھا۔

عمر میاں کا گھر گاؤں میں دوسرا بڑا گھر تھا۔ پہلا بڑا گھر سابق پردھان نبیل بابا کا تھا۔ اس کا نام ہی 'بڑگھروا' یعنی بڑا والا گھر تھا۔ اب وہ گھر کئی حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ہمارے پورے علاقے میں صرف ایک ہی گھر میں دونالی بندوق تھی اور وہ اسی بڑگھروا میں تھی۔ گھر کے رقبے اور ڈیزائن کے اعتبار سے عمر میاں کا گھر بھی بڑا تھا۔ وہ بھی بڑگھروا کی مانند کھپریل کا تھا مگر مغرب کی جانب کا کچھ حصہ دو منزلہ تھا۔ گاؤں میں یہ دوسرا دو منزلہ گھر تھا۔ ایک اور گھر تبارک میاں کا تھا۔ وہ بھی کھپریل کا تھا اور اس میں بھی ایک کوٹھری دو منزلہ تھی۔ ان دنوں ایسے مکانوں میں دوسری منزل پر جانے کے لیے پٹرے کا زینہ بنتا اور دوسری منزل کا فرش بھی پٹرے کا ہی ہوتا۔

عمر میاں کے گھر میں شمال کی جانب بڑا سا برآمدہ تھا جو عام راستے سے قدرے اوجھل رہتا۔ بڑا سا آنگن۔ مشرق کی جانب بڑا سا تالاب جسے 'سگروا' کہتے تھے، اب بھی کہتے ہیں۔ سگروا کے مشرق میں گاؤں کا قبرستان۔ سگروا کی کھدائی سے جو مٹی نکلی تھی وہی مشرق کی جانب پاٹ دی گئی جس کی وجہ سے بڑا اور طویل سا ٹیلہ بن گیا۔ وہی قبرستان ہے۔ ان کے مکان اور سگروا کے درمیان دائیں طرف بنسواری اور بائیں جانب آم اور کٹہل کے متعدد درخت۔ یہ

سب انہی کے تھے۔ برآمدے کے شمال میں بڑا سا دوارہ اور اس کے بعد مشرق سے مغرب کی جانب اصل مکان کے متوازی بڑا سا ایک دودرہ تھا جسے مقامی زبان میں ''گھاری'' کہتے ہیں اور جس میں بیل اور بھینسیں بندھتی رہی ہیں۔ دونوں کا مجموعی رقبہ اتنا بڑا کہ گھاری کے مغرب میں ہمارا گھر، اس کے جنوب میں دو بھائیوں بہر یچی اور کتارو کے گھر۔ اس کے بعد اکبر علی کا گھر۔ عمر میاں کا گھر ہمارے گھر کے ساتھ ساتھ مزید ڈھائی گھروں کا احاطہ کرتا۔ عمر میاں کے اور ہم لوگوں کے گھر کے درمیان عام راستہ جو شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی جانب جانے والوں کے لیے ایک اہم راستہ ہے۔ بہر یچی اور کتارو کے گھروں کے سامنے بمشکل پانچ چھ فٹ کا راستہ چھوڑ کر اس سرے سے اس سرے تک ایک قد آدم دیوار کی تعمیر۔ دیوار کی وجہ تعمیر پر بعد میں روشنی ڈالی جائے گی۔ اس دیوار اور عمر میاں کے مکان کے بیچ میں کم از کم پندرہ فٹ چوڑی اور تیس فٹ لمبی خالی جگہ۔ اصل مکان کی مغربی دیوار سے لگا ہوا ایک اور چھوٹا سا برآمدہ اور ایک چھوٹا سا کمرہ۔ کمرے میں عمر میاں کا ایک بکسا ہوتا جس میں بیٹری اور سیل وغیرہ ہوتے۔ وہ برسات کے سیزن میں پلاسٹک کے جوتوں کا بھی کام شروع کر دیتے۔ اس کمرے میں ٹاٹ کی ایک بڑی سی جھلی میں جوتے رکھے ہوتے۔

جب کچھ لوگ یہ جاننے کے لیے کہ وہ پرچار کرنے کیوں نہیں نکل رہے ہیں، ان کے گھر پہنچے تو نہ صرف ان کی شخصیت بدلی ہوئی پائی گئی بلکہ مغربی برآمدے کی بھی صورت بدل گئی تھی۔ دیواروں پر سفیدی پھیر دی گئی تھی اور ان پر ہرے رنگ سے بہت سی قرآنی آیات لکھ دی گئی تھیں۔ اس تبدیلی کے اگلے روز جب میں برآمدے میں گیا تو نورو ماما نے مجھ سے پوچھا:

''سہیل بابو سفر پر نکلنے کی دعا یاد ہے''۔

''نہیں ماما مجھے تو نہیں یاد ہے، آپ کو یاد ہے''۔ میں نے کہا۔ گاؤں میں ننھال ہونے کی وجہ سے عمر دراز افراد ہم لوگوں کے نانا اور نوجوان ماما لگتے تھے۔

''ہاں ہاں وہ بھی یاد ہے اور دوسری بہت سی دعائیں بھی یاد ہیں''۔ انھوں نے عالم سرشاری میں جواب دیا اور پھر فر فر فر بہت سی دعائیں سنا دیں۔

ادھر جب گاؤں کے چند لوگ وہاں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ برآمدے میں چارپائی

بچھی ہوئی ہے۔ جس پر عمر میاں بیٹھے 'ڈلوا' میں قرآن مجید رکھے تلاوت کر رہے ہیں۔ (ڈلوا مونج سے بنُے ہوئے بڑے سے طشت کو کہتے ہیں)۔ جانے والوں نے سلام کیا۔ پتہ نہیں انھوں نے جواب دیا یا نہیں مگر تلاوت میں مشغول رہے۔ ان لوگوں نے تلاوت میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور واپس چلے گئے۔ کئی روز ہو گئے مگر عمر میاں اب بھی پرچار کے لیے نہیں نکلے۔ پھر کچھ لوگ گئے۔ ڈلوا میں چارپائی پر قرآن رکھا ہوا تھا۔ ڈلوا رحل کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ عمر میاں تلاوت کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔ وہ کمر کے سہارے چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ لوگوں نے سلام کے بعد ان سے پوچھا:

''ارے میاں صاحب پرچار کے لیے نکل نہیں رہے ہیں کیسے جیتیں گے''۔

وہ کچھ بولے نہیں بس نیم وا آنکھیں کیے انگشت شہادت سے قرآن کی جانب اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ انھوں نے پھر اپنا سوال دوہرایا۔ انھوں نے پھر اشارہ کیا۔ لوگوں نے تیسری بار سوال پوچھا تو انھوں نے بڑی عقیدت، محبت اور اعتماد سے بھرپور لہجے میں قرآن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہ جو کتاب ڈلوا میں رکھی ہوئی ہے وہی چاہے گی تو جیت جائیں گے چاہے گی تو ہار جائیں گے۔ ہم پرچار کرنے نہیں جائیں گے۔ ہمارا پرچار وہی کرے گی''۔ اور پھر بڑے روحانی انداز میں انھوں نے آنکھیں موند لیں جیسے لیٹے لیٹے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔

ان کے اس جواب کے، چھوٹے سے گاؤں میں پھیلنے میں دیر نہیں لگی۔ جدھر دیکھیے اس واقعہ کا چرچا، اسی کی گفتگو۔ لوگوں پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ رفتہ رفتہ ان کے حق میں فضا سازگار ہونے لگی۔ لوگ ان کی شخصیت میں آئی اس قابل ذکر اور روحانی تبدیلی کو سراہنے لگے۔ پھر تو یہ ہوا کہ وہ اپنے گھر پر تلاوت کرتے اور اچانک ان کے ''بزرگ'' ہو جانے کے قائل لوگ گاؤں میں گھوم گھوم کر ان کا پرچار کرتے۔ دوسرے گاؤں میں بھی وفود کا دورہ ہونے لگا۔ خدا خدا کر کے الیکشن کا وقت آیا اور ان کے حق میں زبردست پولنگ ہوئی۔ وہ کافی ووٹوں سے جیت گئے۔ ان کے حریفوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ لوگ بہت خوش ہوئے کہ ایک اچھے، سچے اور ایماندار شخص کو انھوں نے پردھان بنایا ہے۔

ان کو پردھان بنے ہوئے ابھی چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ انھوں نے اپنا چولا بدلا اور ایسا رنگ دکھایا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ ان کے برآمدے کی بھی ہیئت بدل گئی۔ قرآنی آیات کا صفایا کر دیا گیا۔ نئی سفیدی پھیر دی گئی۔ وہ چارپائی بھی ہٹ گئی جس پر وہ بیٹھ کر تلاوت کیا کرتے تھے۔ ڈلوا بھی لاپتہ ہو گیا اور قرآن مجید بھی۔ ان کی بیٹھک اب پھر پرانے دالان میں ہونے لگی جہاں ان کے ہم مشرب، ہم نوالہ و ہم پیالہ پہلے بھی ان کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔

ترکیب و تکلف لاکھ کرو فطرت کہیں چھپتی ہے اکبر
جو مٹی ہے وہ مٹی ہے جو سونا ہے وہ سونا ہے

انھوں نے بحیثیت پردھان پہلا کام یہ کیا کہ گاؤں کے دونوں تالابوں یعنی 'سگروا' اور 'پوکھروا' کا چند لوگوں کے نام پٹہ کر دیا۔ وہ بھی کن لوگوں کے نام جن کی 'اخلاقی جرأت' پورے علاقے میں مشہور تھی۔ اب ان دونوں تالابوں کے مالک یہ چند افراد ہو گئے۔

ان دنوں چونکہ ندی نالے بہت ہوا کرتے تھے، بارش بھی بہت ہوتی تھی، اس لیے برسات کے موسم میں جب چاروں طرف سے پانی بہہ کر ان دونوں تالابوں میں آتا تو بہت ساری مچھلیاں بھی آتیں۔ مئی جون کے مہینے میں کسی روز اعلان کر کے مچھلیاں ماری جاتیں اور پورا گاؤں اس میں شرکت کرتا۔ ہمارے ابا کی تحریک پر گاؤں والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب انفرادی طور پر مچھلی نہیں ماری جائے گی بلکہ یہ کام اجتماعی طور پر ہوگا۔ مقررہ دن پر مچھلی ماری جاتی اور پھر وہی مچھلیاں گاؤں والوں میں فروخت کر دی جاتیں جس سے مدرسے کی ہزاروں روپے کی اضافی آمدنی ہو جاتی۔

اب جو گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ عمر پردھان نے پٹہ کر دیا ہے اور جن کے نام کیا ہے وہ دھمکی آمیز انداز میں اعلان کر رہے ہیں کہ اب اگر کسی نے سگروا اور پوکھروا میں پیر بھی ڈالا تو اس کے پیر کاٹ لیے جائیں گے، تو پہلے تو وہ سکتے میں آ گئے، پھر اشتعال انگیزی پیدا ہوئی۔ عمر پردھان سے پوچھا گیا تو انھوں نے الٹا سلٹا جواب دے دیا۔ لوگوں میں زبردست غصہ۔ مگر کریں تو کیا کریں۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ روزانہ ہنگامہ روزانہ لڑائی۔

ہنگامہ جتنے زور کا ہوتا ان کی مجلس شوریٰ میں قہقہے بھی اتنے ہی زور سے بلند ہوتے۔

ایک روز ان کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن نے کہا: ''عمر بھائی یہ کیا کر دیا تم نے''۔

انھوں نے بڑی سنجیدگی سے اور درویشانہ انداز میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر جواب دیا:

''ابھی تو صرف ایک 'کو کرو چھی' چھوڑی ہے سارے جولاہے اُبھر آگئے ہیں۔(یعنی آپس میں الجھ گئے ہیں)۔ابھی اور بہت سی کو کرو چھی میں نے ڈبیا میں بند کر کے رکھی ہیں''۔

تم نے اے دیکھنے والو ابھی دیکھا کیا ہے؟

کو کرو چھی ایک مکھی ہے جو عام مکھیوں سے کچھ بڑی مگر انتہائی سخت جان ہوتی ہے جو گائے، بیل اور بھینس کے جسم سے چمٹ جاتی ہے۔اس کے دانت جلد میں پیوست ہو جاتے ہیں اور جب تک اس کو نکال نہ دیا جائے جانور بڑی بے چینی میں رہتا ہے۔اس کا نکالنا اور مارنا بھی مشکل ہوتا ہے۔جب تک کسی سخت چیز پر رکھ کر کسی سخت چیز سے چوٹ نہ کی جائے وہ مرتی نہیں ہے۔

عمر میاں کی تعلیم تو واجبی سی تھی مگر وہ فقرہ بازی میں ماہر تھے۔ان کا یہ فقرہ بھی بہت بلیغ ہے۔یعنی جو ایک کو کرو چھی چھوڑی گئی ہے وہ کبھی اس شخص کے جسم سے چمٹتی ہے اور کبھی اس شخص کے جسم سے اور جس سے چمٹتی ہے وہ اچھلنے کودنے لگتا ہے۔

تو انھوں نے کہا کہ ابھی تو صرف ایک کو کرو چھی چھوڑی ہے اور یہ حال ہے۔ابھی تو بہت سی کو کرو چھی ڈبیا میں بند ہیں۔ان کے اس جواب پر زور کا قہقہہ پڑا اور ان کی محفل زعفران زار ہو گئی۔ان کے احباب ان کی عقل کے ایک بار پھر قائل ہو گئے:

اللہ رے فسوں گر تری آنکھوں کا اشارہ!

عمر میاں دوسری بار بھی جیت گئے۔اس کے بعد دوسرے لوگ پردھان بنتے رہے لیکن پٹہ ختم نہیں ہوا۔پچیس تیس برسوں تک قائم رہا۔ان کے مالکان ان میں مچھلیاں جلاتے اور کماتے کھاتے رہے اور مدرسہ اپنی ایک مستقل آمدنی سے محروم رہا۔گاؤں کے لوگ مچھلی مار کر کھانے کو ترس گئے۔اب جا کر نئے پردھان حبیب الرحمٰن نے پٹہ تڑوایا ہے۔اس نے الیکشن ہی اس بنیاد پر لڑا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو پٹہ ختم کرا دے گا اور دونوں تالاب عوام کے لیے وقف کر دیے جائیں گے۔آج صورت حال یہ ہے کہ لوگ جب چاہیں مچھلی ماریں اور لذت کام و دہن سے کام لیں۔

عمر پردھان چھوٹے سے قد کے دبلے پتلے جسم کے مالک تھے۔ چہرے پر ٹھڈی داڑھی ، قمیص، دھوتی اور جوتا پہنتے۔ ایک کندھے پر انگوچھا رکھا رہتا۔ ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ جس پر بے ساختہ پیار آجاتا۔ ہنس ہنس کے گفتگو کرتے۔ بڑے سبک رو تھے۔ چلتے تو زمین پر اس نزاکت سے پیر رکھتے کہ جیسے ابھی لڑکھڑا کر گر پڑیں گے۔ بارہ ایک بجتے ہی بکسا اٹھاتے، سائیکل کے کیریئر پر باندھتے اور قریبی بازار چلے جاتے۔ مغرب کے بعد واپس آتے۔ ان کا بیٹا نورالحسن بھی اپنی سائیکل سنبھالتا، کیریئر پر بکسا رکھتا اور پیچھے پیچھے ہو لیتا۔ لیکن ایسے ہی ننھے قدوں کی بیکراں ہنگامہ آرائیوں کو دیکھ کر ہی شاعر نے کہا ہوگا:

ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا ہو گئی

ان کے آباء واجداد نے کھیت، باغ، بڑا سا مکان اور کافی دولت چھوڑی تھی۔ لیکن عمر میاں اور ان کے چھوٹے بھائی لیاقت میاں کی کچھ 'خاص عادتوں' نے رفتہ رفتہ آبائی دولت کو گھن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ اس سال فلاں جگہ کا کھیت بکا تو اگلے سال فلاں جگہ کا۔ کبھی کوئی درخت بیچ دیا تو کبھی کوئی۔

مقامی سانتھا بلاک سے ان کا گہرا ربط ضبط رہتا۔ انھیں حکومت کی متعدد اسکیموں کا پتہ ہوتا۔ انھیں معلوم ہوتا کہ کب کس اسکیم کے تحت حکومت سے قرضہ ملنے والا ہے۔ اسکیم آنے سے قبل ہی بی ڈی او اور دوسرے اہلکاروں کے ساتھ سیٹنگ ہو جاتی۔ ادھر اسکیم آتی ادھر دھڑ سے ان کو قرضہ مل جاتا۔ اور سب سے پہلے ملتا۔ پھر تو للے تللے۔ اس معاملے میں وہ اس نظریے کے قائل تھے کہ 'جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے'۔

ان دنوں عام طور پر حکومت کی جانب سے قرض میں رقم نہیں دی جاتی۔ کبھی بھینس مل گئی تو کبھی پمپنگ سیٹ اور کبھی کوئی دوسری چیز، جاندار یا بے روح۔ مقصد یہ ہوتا کہ قرض لینے والا پیسہ اڑا نہ ڈالے بلکہ وہ اس کی مدد سے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالے۔ لیکن عمر میاں اور بعد میں ان کے بیٹے نورو کا یہ حال تھا کہ وہ پہلے سے ہی گاہک تیار کر لیتے۔ وہ بی ڈی او سے ایک ہاتھ سے جانور یا جو بھی چیز ملتی، لیتے اور وہیں دوسرے ہاتھ سے سب کے سامنے مقررہ گاہک کو بیچ دیتے۔ حکومت قرضے کے طور پر مذکورہ شے کی جو قیمت طے کرتی وہ اس سے نصف سے بھی کم میں سودا

طے کر لیتے۔ جو رقم ملتی اس میں سے 'اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے' کے مصداق بلاک کے عملے کو اس کا حصہ مل جاتا۔ اس طرح وہ قرضے کی معمولی رقم لے کر خوش و خرم گھر کو لوٹتے۔ ان کے انداز رہائش میں آئی 'آمرانہ تبدیلی' سے لوگ سمجھ جاتے کہ انھوں نے پھر سرکاری قرضہ لیا ہے۔ ان کے بیٹے سے ایک بار میں نے پوچھا:

''نورو ماما آپ لوگ اتنا سرکاری قرضہ لیتے ہیں، کیا دینے کا ارادہ نہیں ہوتا اور اگر سرکار وصولی کی سختی کرنے لگے تو کیا ہوگا''۔

''کیا ہوگا بھانجے، کچھ نہیں ہوگا۔ (آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں)۔ ارے ہمارے پاس ہے ہی کیا جو سرکار لے گی۔ بس آگے...... ہے اور پیچھے...... ہے''۔ انھوں نے دو ایسے ہم قافیہ لفظوں کا استعمال کیا تھا جو میں تحریر نہیں کر سکتا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

ایمرجنسی کے زمانے میں واقعی حکومت کی جانب سے قرضوں کی وصولی کے لیے سختی شروع ہوگئی۔ ہمارے گاؤں میں صرف یہی ایک خاندان قرض لینے میں ماہر نہیں تھا، دوسرے بہت سے خاندان بھی تھے۔ ان دنوں دیہی علاقوں میں گاڑیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ اگر کہیں دور سے کوئی جیپ دھول اڑاتی نظر آتی تو قرض داروں میں بھگدڑ مچ جاتی۔ وہ سمجھ جاتے کہ وصولی والے آرہے ہیں۔ کوئی بھاگ کر ارہر کے کھیت میں پناہ لیتا تو کوئی گنے کے اور کوئی کہیں اور۔

ایک بار نورالحسن سچ مچ پکڑ لیے گئے۔ اس وقت میں قصبہ بانسی کے رتن سین ڈگری کالج سے بی اے کر رہا تھا۔ بانسی میں اس وقت ہمارے علاقے کی تحصیل تھی۔ تحصیل کے عملہ نے نورو ماما کو پکڑ کر تحصیل کے احاطے میں واقع ایک دس بائی دس کے لاک اپ میں جس میں لوہے کے سریوں کا گیٹ لگا ہوا تھا، لے جا کر بند کر دیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں کالج سے بذریعہ سائیکل لوٹتے ہوئے دوپہر کے وقت تحصیل کے احاطے میں گیا۔ ہزاروں افراد اپنے اپنے کام سے وہاں موجود تھے۔ نورو ماما لاک اپ میں بند تھے۔ اس میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لوہے کا کھلا اور جالی دار گیٹ اس دیوار سے اس دیوار تک تھا۔ میں نے جا کر خیریت پوچھی۔ ان کے چہرے سے کسی بھی قسم کی فکرمندی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا:

''نورو ماما اس میں کیسے رہتے ہو اور پیشاب پاخانہ کے لیے کہاں جاتے ہو''۔

"تحصیل کا ایک آدمی صبح شام ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا کر گاؤں کے باہر کھیتوں میں لے جاتا ہے"۔ انھوں نے بڑی بے فکری سے مسکراتے ہوئے اور فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

"اور دن میں پیشاب کی ضرورت پڑے تو"۔

"بس کونے میں بیٹھ کے کر لیتا ہوں"۔ انھوں نے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کھانے کا کیا ہوتا ہے"۔

"کسی روز گھر سے آگیا تو کھا لیا ورنہ یہ لوگ بھی کھلا دیتے ہیں"۔ وہاں سے ہمارا گاؤں ۲۵ کلومیٹر دور ہے۔ دیہی علاقوں میں یہ مسافت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ روز روز کیسے کھانا پہنچتا اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ آمد و رفت کے ذرائع انتہائی محدود ہوں۔ وہاں جانے اور آنے میں پورا ایک دن لگ جاتا۔ اس طرح وہ ایک ہفتہ اس کھلے لاک اپ میں بندرہ کر اور اپنی سزا کاٹ کر مسکراتے ہوئے واپس گھر لوٹے۔

مری رسوائی اور غیروں کے طعنے، ان کی خاموشی
یہی دو چار باتیں اور کیا ہے داستاں میری

اس کے بعد تو ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ جب بھی کسی اسکیم کی بھنک ملتی بلاک پر حاضر ہو جاتے۔

دونوں باپ بیٹوں کو نئی نئی چیزیں خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ ٹرانزسٹر آیا تو سب سے پہلے انھوں نے لیا۔ ٹیپ ریکارڈر آیا تو سب سے پہلے عمر میاں کے گھر پہنچا۔ نئی نئی سائیکل لینے کا بھی شوق تھا۔ جب بھی نئی سائیکل لاتے تو اسے خوب سجاتے۔ رنگ برنگی ربن باندھتے۔ جب ذرا پرانی ہونے لگتی تو بیچ دیتے اور دوسری نئی لے آتے۔ موپیڈ موٹر سائیکل چلی تھی وہ بھی سب سے پہلے انہی کے گھر آئی تھی۔

پردھان بننے سے بہت پہلے کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ اس وقت عمر میاں کے بڑے داماد مُسیّد جو کہ ان کے بھانجے بھی تھے، ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ماما بھانجے ایک دوسرے کے مزاج شناس تھے اور مسید اپنے ماما کے اشاروں کو یوں سمجھتے تھے جیسے انھوں نے کسی

اسکول میں اس کی تعلیم حاصل کی ہو۔ ہمارے گھر کے شمال میں ایک گھر چھوڑ کر حسن بابا کا گھر تھا۔ حسن بابا اور عمر میاں آپس میں دوست تو تھے لیکن ان میں دوستی سے زیادہ ایک دوسرے کو چھیڑنے اور ستانے کا رشتہ تھا۔

حسن بابا کے گھر کے بعد مسجد اور پھر دو تین گھروں کے بعد گاؤں کا بازار۔ ایک روز حسن بابا بازار میں خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اچانک ایک اجنبی آیا اور اس نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا: ''بھیا اس گاؤں میں کوئی نائی ہے''۔

لوگوں نے حسن بابا کی طرف اشارہ کر دیا۔ انھوں نے پوچھا: ''ہاں بابو کا کہہ رہے ہو''۔

''بھیا داڑھی بنوانی تھی اگر اس گاؤں میں کوئی نائی ہو تو بتا دو''۔

حسن بابا کی رگِ شرارت پھڑک اٹھی۔ انھوں نے کہا: ''داڑھی بنوانی ہے یا کچھ اور''۔

''نہیں صرف داڑھی بنوانی ہے''۔

''اچھا ایسا کرو ادھر چلے جاؤ۔ تین چار مکان کے بعد محمد عمر کا گھر پوچھ لینا۔ وہ نائی ہیں وہی داڑھی بناتے ہیں''۔

وہ شخص مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔ حسن بابا بھی حالات کی نزاکت کا اندازہ کر کے چپکے سے اپنے گھر چلے گئے اور اندر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے اس شخص نے عمر میاں کے گھر ہی جا کر پوچھا کہ محمد عمر کا گھر کون سا ہے۔

حسن اتفاق کہ برآمدے میں عمر میاں بھی تھے اور ان کے مزاج شناس داماد مسید بھی۔ انھوں نے کہا: ''ہاں بابو یہی گھر ہے بتاؤ کیا کام ہے، بیڑی ویڑی چاہیے''۔

''نہیں داڑھی بنوانی ہے''۔ اس شخص نے جواب دیا۔ پہلے تو عمر میاں ہکا بکا رہ گئے۔ پھر ان کے دماغ نے تیزی سے کام کیا اور وہ سمجھ گئے کہ کسی نے شرارت کی ہے۔ ان کی بھی رگِ شرارت پھڑک اٹھی۔ انھوں نے اپنے داماد سے کہا:

''مسید ذرا اُسترا وغیرہ لے آؤ، بابو کی داڑھی بنانی ہے''۔

''اچھا ماما ابھی لایا''۔ بغیر اشارے کے ماما کا اشارہ سمجھنے والے مسید گھر کے اندر گئے۔ چند منٹ کے بعد ایک بڑا سا گنڈاسا لے کر نکلے اور بولے کہ لو ماما ان کی داڑھی بنا دو۔

اب اس شخص کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ جیسے بم پھٹ گیا ہو۔ وہ بوکھلا گیا اور اٹھ کر بھاگنے لگا۔ عمر میاں نے گالیوں کا فوارہ چھوڑتے اور گنڈاسا بدست دوڑتے ہوئے آواز لگائی:

''ابے تری ماں...... تری بہن...... رک داڑھی نہیں بنوائے گا کیا، بھاگا کہاں جا رہا ہے سالے۔ آ! میں اچھے سے تیری داڑھی بناتا ہوں''۔

وہ شخص تو جان چھوڑ کر بھاگا۔ ادھر عمر میاں کو اس کی کرید ہوگئی کہ کس نے یہ شرارت کی ہے۔ مذکورہ شخص جنوب کی جانب بھاگا تھا اور عمر میاں شمال کی جانب بازار کی طرف لپکے۔ وہاں جا کر دیکھا تو چند لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ 'کانڈ' ہو گیا ہے۔ سب نگاہیں نیچی کیے چھپ چھپ کے ہنستے رہے۔ انھوں نے پوچھا کہ کس نے اس آدمی کو ان کے گھر بھیجا تھا۔ لوگوں کا حال یہ کہ ایک چپ ہزار چپ۔ انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو یہ حرکت حسن کی ہے۔

عمر میاں کے مزاج میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دوسروں کو ہلکی پھلکی مصیبت میں ڈال کر مزا لینا ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ انھیں اس میں بڑی لذت ملتی۔ لیکن ان کے چہرے پر ایسی بچکانہ معصومیت ہوتی کہ اس پر بلا کا پیار آتا۔ ''اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتی''۔ اگر کسی شخص نے غلطی سے ان سے کوئی راستہ پوچھ لیا جیسا کہ عام طور پر گاؤں میں اجنبی لوگ پوچھا کرتے ہیں، تو سمجھو اس کی شامت آ گئی۔ ایک بار ایک شخص نے ان سے پوچھا:

''بابو ہمیں گوٹھہا جانا ہے کیسے جائیں''۔

''اچھا گوٹھہا جانا ہے۔ میں تم کو ایک آسان سا راستہ بتاتا ہوں تم سیدھے وہیں جا کر پہنچو گے''۔ انھوں نے جواب دیا۔ راہگیر خوش ہو گیا۔ گوٹھہا ہمارے گاؤں سے چار پانچ کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ انھوں نے اسے جنوب کا راستہ بتاتے ہوئے کہا:

''بابو ایسا کرو کہ ادھر دکھن جو راستہ گیا ہوا ہے اس کو پکڑ لو۔ تین کلومیٹر کے بعد بلہر آئے گا، وہاں ایک سڑک ملے گی، وہاں سے پورب کی طرف مڑ جانا، وہاں پھر ایک سڑک آئے گی وہاں سے اتر کی طرف گھوم جانا۔ کچھ دور چلنے کے بعد گوٹھہا آ جائے گا''۔

اس طرح انھوں نے پانچ کلومیٹر کے راستے کو پندرہ بیس کلومیٹر میں تبدیل کر دیا۔ ایسا راستہ وہ عموماً بتاتے ہی رہتے تھے۔ اگر کوئی نیا راہگیر بازار میں آتا اور راستہ پوچھتا تو لوگ بھی مزا

لینے کے لیے عمر میاں کے حوالے کردیے۔

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

ہمارے گاؤں سے سانتھا بلاک تک پہلے کچا راستہ ہوا کرتا تھا۔ برسات کے دنوں میں پورا راستہ پانی سے بھر جاتا۔ رفتہ رفتہ زیادہ تر حصہ تو سوکھ جاتا لیکن درمیان میں پڑنے والی ایک بڑی سی گڑہی (ایک چھوٹا تالاب) کے پاس مہینوں تک پانی بھرا رہتا۔ وہاں جو چار پانچ فٹ کا چوڑا راستہ تھا وہ بالکل گڑہی کے ساحل پر تھا۔ دوسری طرف کھیت تھے۔ ذرا سی لغزش ہوئی کہ غڑاپ سے گڑہی کے اندر۔ کم از کم سینے تک پانی میں۔ ایک بار وہ سانتھا بازار سے شام کے وقت لوٹ رہے تھے۔ ساتھ میں بہت سارے لوگ بھی تھے۔ بڑھروا کے ایک رشتے دار بھی، جو لکھنؤ میں باغبانی محکمہ میں ملازمت کرتے تھے، آ رہے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر ہمارے گاؤں میں آتے۔ اس لیے سبھی ان کو جانتے اور پہچانتے تھے۔ عمر میاں نے ان سے کہا:

''بابو ہمارے ساتھ ہی ساتھ آنا ورنہ گہرے پانی میں چلے جاؤ گے''۔

جب اس مخصوص جگہ پر پہنچے اور سب گھٹنے تک پانی میں چل رہے تھے تو عمر میاں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ وہ بیچارے راستے سے انجان تھے اور ناپ تول کر قدم رکھ رہے تھے۔ اس لیے پچھڑ گئے۔ عمر میاں گڑہی کے پاس والا حصہ عبور کرنے کے بعد آگے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہیں سے وہ ان کو ڈائرکشن دینے لگے۔ ذرا بائیں ذرا دائیں۔ ذرا ادھر ذرا ادھر۔ اور جب وہ گہرے پانی کے قریب والے پوائنٹ پر پہنچے تو انھوں نے زور سے کہا کہ ارے بابو بائیں لے لو بائیں ہاں تھوڑا اور بائیں۔ وہ بیچارے لاعلم تھے۔ بائیں دو چار قدم بڑھ گئے اور پھر غڑاپ سے سینے تک پانی کے اندر۔ عمر میاں جو چاہتے تھے وہ ہو گیا۔ سارے راہگیر ہنسنے لگے۔ اس پر عمر میاں نے مصنوعی غصے سے ان لوگوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

''تم لوگ ہنس رہے ہو۔ اوہو، ہوہو، چہ چہ، چہ چہ، بابو نے اتنا اچھا سوٹ بوٹ پہن رکھا تھا سب خراب ہو گیا۔ ارے کیسے آپ وہاں چلے گئے۔ میں ادھر کو بتا رہا تھا اور آپ ادھر کو جا رہے تھے۔ ہو گئی نہ سب گڑبڑ''۔

اب وہ بیچارے شریف آدمی بھلا کیا بتاتے کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے عمر میاں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گویا کہہ رہے ہوں 'من خوب می شناسم پیران پارسا را'۔ یہ واقعہ گاؤں میں مشہور ہو گیا اور لوگوں نے خوب لطف لیا۔ لوگوں نے اس لیے بھی لطف لیا کہ ان سے مذاق کا رشتہ تھا۔ ان کی بہن بڑگھروا میں بیاہی تھیں۔

عمر میاں بہت دور اندیش اور زیرک تھے۔ فقرہ بازی میں مہارت تو تھی ہی گفتگو بھی بہت لچھے دار کرتے۔ اگر کسی کی تعریف کرتے تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی مثل پھیکی پڑ جاتی۔ وہ اس شخص کو عرش پر بٹھا دیتے۔ اگر کسی میں خرابی نکالنی ہو تو ایسی برائی کرتے کہ تحت الثریٰ میں بھی اسے جگہ نہیں ملتی۔ اگر وہ اپنے پہ آجاتے تو کسی کو بھی نصف گھنٹے کی گفتگو میں شیشے میں اتار لیتے۔

انھوں نے کافی تگ ودو کے بعد اپنے دوسرے اور آخری بیٹے محمد اخلاق کی شادی طے کی۔ انھوں نے کوشش کی کہ اس کی بھنک ان کی مجلس شوریٰ کے ارکان کو نہ لگے۔ بڑی خاموشی سے ساری کارروائیاں مکمل ہوئیں۔ مجلس شوریٰ کے ارکان یا ارکانِ چنڈال چوکڑی کو جب علم ہوا تو وہ کف افسوس مل کر رہ گئے۔ ان لوگوں کو کھجلی ہونے لگی کہ انھیں کیوں خبر نہیں کی گئی۔ انھوں نے جب ان سے بالا بالا معاملہ طے کرنے کی شکایت کی تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے بات ٹال دی کہ ارے تم لوگوں کو بتانے کا موقع ہی نہیں ملا، بس بڑی عجلت میں سارے کام ہو گئے۔ حالانکہ میں تو خود چاہتا تھا کہ تم لوگ بھی اس معاملے میں شریک رہتے۔ آخری جملہ انھوں نے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ادا کیا۔

چنڈال چوکڑی کے ارکان کی آپس میں خوب بنتی تھی۔ لیکن ان کے مابین جو رشتہ تھا وہ بربنائے خلوص نہیں بلکہ بربنائے عیب جوئی تھا۔ وہ ایک دوسرے کی کمیوں، برائیوں اور خرابیوں کو بڑی دلجمعی سے تلاش کرتے اور کسی میں کوئی نئی برائی مل جاتی تو یوں جشن مناتے جیسے انھیں کوئی کھوئی ہوئی نعمت مل گئی ہے۔ عمر میاں اس چنڈال چوکڑی کے امام تھے:

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے، ٹیڑھے، ترچھے، تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

بہر حال شادی طے ہو گئی اور بارات جانے کی تاریخ آ گئی۔ عمر میاں نے اپنی چنڈال چوکڑی کو بلایا اور بڑے خلوص سے ان کو بارات میں چلنے کی دعوت دی۔ سب خوشی خوشی تیار ہو گئے۔ بارات پہنچ گئی، باراتیوں کی خاطر تواضع ہو گئی۔ ادھر ارکان چنڈال چوکڑی کی کھجلی بڑھ گئی۔ وہ اجتماعی طور پر ادھر ادھر پراسرار انداز میں آنے جانے لگے۔ کبھی بارات سے اٹھ کر عمر میاں کے سمدھیانے پہنچ جاتے اور کبھی کسی دوسری جگہ چلے جاتے۔ عمر میاں بھی ان کے پیچھے پیچھے لگے رہے، وہ جہاں جاتے وہ بھی تڑ سے وہیں پہنچ جاتے اور بہ زبان شاعری کہتے جاتے 'اجی روٹھ کر اب کہاں جایئے گا، جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا'۔ تو ڈال ڈال میں پات پات والا معاملہ تھا۔

جب یہ مشق کافی دیر تک جاری رہی تو ایک باراتی نے جو یہ پورا منظر شروع سے دیکھ رہا تھا، عمر میاں سے پوچھا:

"کیا بات ہے میاں صاحب وہ ادھر ادھر آ جا رہے ہیں اور آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے لگے ہیں، کوئی پریشانی کی بات ہے کیا"۔

"ارے بابو کیا بتائیں وہ سب سالے بڑے حرامی ہیں"۔

"ارے وہ لوگ تو آپ کے گہرے دوست ہیں اور آپ ان کو گالیاں دے رہے ہیں"۔

"دوست ہیں اسی لیے تو ان کی فطرت سے واقف ہوں"۔

"آخر بات کیا ہے بتایئے نا"۔ اس شخص نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔

"وہ سب میرے سمدھی کو ڈھونڈ رہے ہیں"۔

"تو ڈھونڈنے دیجیے اچھا ہے کچھ میل ملاپ ہو جائے گا، ان میں آپس میں کچھ باتیں ہو جائیں گی، کچھ دوستی ہی بڑھے گی"۔

"اسی کا تو ڈر ہے، میں یہی تو نہیں ہونے دینا چاہتا"۔

"کیوں اس میں آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

انھوں نے منھ سے گالیوں کا فوارہ چھوڑتے ہوئے کہا: "وہ سب سالے بہت حرامی ہیں۔ وہ میرے سمدھی کو کسی اچھی نیت سے نہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ تو اس لیے ڈھونڈ رہے ہیں تا کہ وہ انھیں میرے خلاف بھڑکا سکیں، میری برائی کر سکیں اور ان کے سامنے میرا کچا چٹھا رکھ

سکیں''۔

''ایسی بات تھی تو ان لوگوں کو آپ کو بارات میں لانا ہی نہیں چاہیے تھا''۔ اس نے کہا۔

''ارے نہیں لاتا تو سالے میرے درختوں کے تمام کٹھل کاٹ ڈالتے''۔ انھوں نے بیچارگی سے جواب دیا۔ بڑے زور کا قہقہہ لگا۔ آس پاس بیٹھے سارے لوگ خوب محظوظ ہوئے۔

کچھ دیر کے بعد انھوں نے پھر سوال کیا:

''تو کیا آپ نے اپنے سمدھی سے اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں جھوٹ بولا ہے''۔ اس پر عمر میاں نے بہ زبان خاموشی جواب دیا:

میں جھوٹ میں چھپاتا ہوں اپنے عیوب کو
اللہ جانتا ہے کہ جھوٹا نہیں ہوں میں

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کوئی بھی نئی چیز مارکیٹ میں آتی تو سب سے پہلے ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ جب پورے علاقے میں کہیں بھی لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا، کسی مسجد میں نہ کسی مندر میں اور نہ ہی کسی شخص کے یہاں، اس وقت انھوں نے لاؤڈ اسپیکر خریدا تھا۔

لاؤڈ اسپیکر آنے کے بعد ان کے داماد مسید اور بیٹے نورالحسن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بنسواری سے سب سے لمبا بانس کاٹا۔ اس کو چھیل چھال کر آخری سرے پر ہارن باندھا اور مغربی جانب خالی جگہ پر گاڑ دیا۔ اب تو صاحب نہ صبح دیکھی جاتی نہ شام، نہ دن نہ رات، جب بھی طبیعت مچلی لاؤڈ اسپیکر آن کیا اور فلمی نغموں کی پلیٹ جسے گاؤں کے لوگ توا کہتے ہیں، رکھ کر گراموفون بجا دیا جاتا۔ اب نہ صرف پورے گاؤں کو بلکہ دوسرے مواضعات کو بھی گانے سنوائے جا رہے ہیں۔ وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ میں نے پہلی بار انہی کے لاؤڈ اسپیکر سے ۱۹۶۰ء میں آئی راج کپور کی فلم چھلیا کا نغمہ 'ڈم ڈم ڈیگا ڈیگا، موسم بھیگا بھیگا، بن پیے میں تو گرا میں تو گرا، ہائے اللہ! صورت آپ کی سبحان اللہ' سنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ ایک بھوجپوری گانا بھی خوب بجاتے جس کے بول تھے 'توری بہنیا کے دوتلہ مکان موری بھوجی'۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ان میں اور ان کے داماد اور بیٹے میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ بعض اوقات یہ شرارت بیہودگی اور بدتمیزی میں بھی بدل جاتی۔ عمر میاں تو اپنی عمر کا لحاظ کر

جاتے مگر ان کے دونوں شاگرد بیہودہ شرارت میں کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ جب لاؤڈ اسپیکر آن ہوتا تو مائکروفون بھی آن کر دیا جاتا۔ گانوں کے درمیان خودساختہ ڈائیلاگ بھی بولے جاتے۔ اگر اس دوران کسی کو ہوا خارج کرنے کی ضرورت پیش آتی تو فوراً گانا بند کر کے مائکروفون نیچے کرتے اور بہ آواز بلند ہوا خارج کرتے۔ اس کے فوراً بعد سب اجتماعی طور پر مائک ہی میں فلک شگاف قہقہے بلند کرتے۔

معاذاللہ دور چرخ بھی کیا کیا دکھاتا ہے!

یہ تینوں حضرات ہمارے ابا کا بڑا احترام کرتے۔ وہ روزہ نماز کی پابندی کے لیے ان کو ڈانٹتے مگر وہ احتراماً خاموش رہتے۔ وہ ریڈیو کا دور تھا۔ ابا کو فلمی نغموں سے شدید نفرت تھی۔ اگر کبھی کوئی شخص گھر پر ان کی موجودگی میں دروازے کے سامنے سے ریڈیو پر گانا بجاتے ہوئے گزر جاتا تو اسے بری طرح ڈانٹتے۔ لہٰذا ریڈیو برداروں کی یہ عادت بن گئی کہ ابا کی موجودگی میں وہ دو گھر پہلے ریڈیو بند کر دیتے اور دو گھر بعد جا کر آن کرتے۔ عمر میاں کے برآمدے میں بھی ریڈیو بجتا رہتا۔ لیکن ابا کی موجودگی میں وہ لوگ بھی یا تو بند کر دیتے یا آواز اس قدر نیچی کر دیتے کہ ہمارے گھر تک نہ پہنچ سکے۔ ابا کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ وہ جب مدرسہ سے گاؤں آتے تو لوگوں کی فرمائش پر تقریر کرتے۔ یک شبی جلسہ ہوتا جس میں مدرسے کے بچوں کو بھی ان کی مشق کی نیت سے شامل کیا جاتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ عمر میاں نے اپنے مکان کی مغربی جانب والی جگہ پر جلسہ کروایا اور ابا کی پوری تقریر بیٹھ کر سنی۔ وہ تقریر کے بعد ابا کی خوب تعریف بھی کرتے۔ اب یہ پتہ نہیں وہ تعریف حقیقی ہوتی یا خوشامدی یا بیوقوف بنانے کی خاطر۔

عمر میاں کا خاندان علمی خاندان تھا۔ دولت و ثروت کی بھی کمی نہیں تھی۔ کسی زمانے میں لوگوں پر اس گھر کا بڑا دبدبہ تھا۔ ان کے خاندان کے کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ بازار کے دن یعنی منگل کے روز تیل پلائی ہوئی درجنوں لاٹھیاں باہر سلیقے سے دیوار سے لگا کر سجا دی جاتیں۔ بزرگ وہیں کرسی لگا کر بیٹھ جاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی سامان لے کر جا رہا ہے تو وہ پوچھتے ہاں بھائی یہ کس کا سامان ہے؟۔ اگر شامت کے مارے اس شخص نے کہہ دیا کہ میرا ہے یا فلانے کا ہے تو منہ سے گالیوں کی بوچھار چھوٹ پڑتی اور دھمکی آمیز انداز میں حکم ہوتا کہ رکھ دے رکھ دے یہیں رکھ

دے، سالے! ان کا سامان ہے، رکھ اور بھاگ۔ اگر کسی نے جواب دیا کہ ارے میاں صاحب یہ تو آپ ہی کا ہے۔ تو خوش ہو جاتے اور کہتے ٹھیک ہے ٹھیک ہے، لے جا لے جا۔ اس خاندان میں فارسی اور اردو کے ایک بڑے عالم بھی گزرے ہیں۔ لیکن عمر میاں اور ان کے بعد کی نسلیں اپنے خاندان کی علمی میراث کا تحفظ نہیں کر سکیں اور آج کی نئی نسل انگوٹھا ٹیک ہے، جاہل ہے۔ پہلے عمر میاں اور پھر نورو ماما دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔

اب اس دیوار کا قصہ بھی سن لیجیے جو اس سرے سے اس سرے تک تعمیر کروا دی گئی تھی۔ توہمات کے شکار اور بدعقیدہ لوگوں کا اب بھی یہ خیال ہے کہ اگر صبح سو کر اٹھتے ہی کسی منحوس کی شکل دیکھ لی تو پورا دن نحوست میں گزرے گا۔ ہمارے مکان کے برابر دونوں بھائی بہر یچی اور کتارو بابا تیلی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر کہ کہیں صبح سو کر اٹھتے ہی تیلیوں کا منہ نہ دیکھنا پڑ جائے اور پورا دن نحوست میں نہ گزارنا پڑے، یہ دیوار تعمیر کروائی گئی تھی۔

اب وہ دیوار جو مقامی طور پر دیوار چین سے کم نہیں تھی رفتہ رفتہ ڈھے گئی ہے صرف نشانات باقی ہیں۔ بہر یچی اور کتارو بابا کے پوتوں نے اونچے اونچے مکانات بنوا لیے ہیں۔ اب سو کر اٹھتے ہی یہی لوگ ان لوگوں کا منہ دیکھتے ہیں۔ اس خاندان کی امارت کی عمارت بھی زمین بوس ہو گئی ہے۔ اس کی علم و حکمت کی دیواریں بھی منہدم ہو گئی ہیں۔ ان کے تو نشانات بھی مٹ گئے ہیں۔ ایک انتہائی ذی علم، دانش مند، تعلیم یافتہ اور اہل ثروت خاندان جہالت اور غریبی کی تاریک سرنگ میں داخل ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھا ہے۔

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

☆☆

محفوظ الرحمٰن

(عقیدت کی شبنم)

میں جب فروری ۱۹۸۷ میں دہلی آیا اور ہفت روزہ ''اخبارِ نو'' کے ایڈیٹوریل میں کام کرنے لگا تو اس وقت دہلی میں دو اخباروں کا شہرہ تھا۔ ایک روزنامہ ''قومی آواز'' کا جس کے ایڈیٹر عشرت علی صدیقی تھے اور دوسرے ہفت روزہ ''اخبار جمعہ'' کا جس کے ایڈیٹر محفوظ الرحمٰن تھے۔ نووارد بساطِ صحافت ہونے کے ناطے میں دونوں سے ناواقف تھا۔ صرف اخبارِ نو کی دنیا تک محدود تھا۔ بہت دنوں کے بعد صحافت کی دنیا مجھ پر آشکارا ہوئی۔ انہی دنوں قومی آواز میں ہڑتال ہوگئی اور اس کے کارکن بے روزگار ہو گئے۔ لیکن یہ بے روزگاری زیادہ دنوں تک نہیں رہی۔ ممبئی کے روزنامہ ''انقلاب'' نے دہلی کی صحافت میں انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جھنڈے والان میں اس کا دفتر قائم ہوا اور ہفت روزہ قومی آواز کی انچارج نور جہاں ثروت، جنھیں صحافتی دنیا میڈم نور جہاں کے نام سے جانتی ہے اور جو بہت اچھی ادیبہ اور شاعرہ تھیں، روزنامہ انقلاب کی ریزیڈنٹ ایڈیٹر مقرر کی گئیں۔ عالم نقوی نیوز ایڈیٹر اور رضوان احمد صدیقی چیف سب بنائے گئے۔ اس طرح دہلی کے صحافتی افق پر ایک ایسا اخبار طلوع ہوا جس کی چمک دمک سے قارئین کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔

انقلاب قومی آواز سے بالکل الگ انداز کا اخبار تھا۔ اس کے صفحات میڈم نور جہاں کے ادبی ذوق کے غماز تھے۔ وہ خبروں میں بھی ادبی چاشنی ڈالنا نہیں بھولتی تھیں۔ یہاں تک کہ

تصویروں کے کیپشن سے بھی ادبی رنگ جھلکتا۔ مجھے ایک تصویر کا کیپشن ابھی تک یاد ہے جو اتنا جامع اور بامعنی تھا کہ اس تصویر کا اس سے بہتر اور کوئی کیپشن نہیں ہوسکتا تھا۔ انقلاب کے فوٹو گرافر نے ایک ایسی لاجواب تصویر کھینچی تھی کہ دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ایک بیل گاڑی پر ایک کار لدی ہوئی تھی اور بیل گاڑی کے ڈرائیور یعنی دونوں بیل اسے کشاں کشاں لیے چلے جا رہے تھے۔ اس کا کیپشن لگایا گیا تھا ''قدامت کے کندھے پر جدت کا جنازہ''۔

میں بھی کبھی کبھار انقلاب کے دفتر جایا کرتا۔ لیکن میرے اندر اتنا شعور نہیں تھا کہ میں اس میں کام کرنے کی کوئی للک اپنے اندر پاتا۔ حالانکہ دو ایک بار میڈم نے اشاروں میں کہا بھی مگر میں نے یہ کہہ کر اپنی دانست میں اپنا دامن چھڑا لیا کہ میں شام میں پانچ بجے تک اخبار نو میں ہوتا ہوں، اس اخبار میں کب کام کروں گا۔ انھوں نے یہ اشارہ بھی دیا کہ میں پارٹ ٹائم کام کرسکتا ہوں۔ وہ مجھے پروف ریڈنگ کے شعبے میں رکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن میری طبیعت جانے کیوں آمادہ نہیں ہوئی۔ غالباً اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ مجھے اخباروں کی ''حیثیت'' کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میرے نزدیک اخبار نو سب سے بڑا اخبار تھا۔ اس کی دوسری وجہ غالباً لاشعور میں بیٹھی ہوئی یہ بات تھی کہ اخبار نو کے مدیر جناب م۔ افضل نے مجھے خط لکھ کر بلوایا ہے اور اپنے اخبار میں نوکری دی ہے لہٰذا مجھے اسی اخبار کی خدمت کرنی چاہیے۔

اس وقت روزنامہ اخبار میں کام کرنے کی کوئی صلاحیت بھی میں اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ میں انقلاب میں چوری چوری چپکے چپکے ایڈیٹوریل روم کی لمبی سی میز دیکھا کرتا جس کے ایک سرے پر عالم نقوی بیٹھے ہوتے اور دونوں کناروں پر مترجمین بیٹھ کر خبروں کا ترجمہ کر رہے ہوتے۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی کہ لوگ کس طرح وہیں بیٹھے بیٹھے سب کے سامنے خبروں کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ لوگ بہت قابل اور باصلاحیت تھے اور میں خود کو ان کی گرد پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے بھی میں نے اس اخبار میں کام کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پائی۔ میں تو اس روم میں جانے کی بھی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ بس پروف ریڈروں اور کاتبوں کی سرحد کے اندر محدود رہتا۔

لیکن انقلاب نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ وہ ابھی گھٹنوں گھٹنوں ہی چل رہا تھا کہ قومی آواز

کے دوبارہ شروع ہونے کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ سارے لوگ جو قومی آواز سے آئے تھے بیک جست واپس اپنے گھر میں پہنچ گئے۔ میڈم نور جہاں اور عالم نقوی تنہا رہ گئے۔ انقلاب کے دفتر میں جہاں زندگی ہمیشہ رواں دواں رہتی تھی سناٹا چھا گیا، ہو کا عالم ہو گیا۔ آخری شمارہ میں میڈم نے جو اداریہ لکھا اس میں انھوں نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ اس کی سرخی بھی بہت جامع اور جاندار تھی۔ وہ بھی مجھے آج تک یاد ہے اور شاید اس سے وابستہ تمام صحافیوں کو بھی یاد ہوگی۔ اس کی سرخی تھی ''ہولی سے دیوالی تک''۔ یہ اخبار ہولی کے موقع پر شروع ہوا تھا اور دیوالی کی آمد پر بند ہو گیا تھا۔ یہ انقلاب کے مالکوں کی اعلیٰ ظرفی تھی یا میڈم نور جہاں کی صلاحیت و قابلیت کا اعتراف کہ انھوں نے ان کو ملازمت سے نہیں نکالا۔ انھیں دہلی میں اپنا نمائندہ بنا لیا اور تاعمر بنائے رکھا۔ عالم نقوی ممبئی چلے گئے اور وہاں انقلاب میں کام کرنے لگے۔

میڈم نور جہاں دلی۔٦، یعنی فصیل بند شہر کی تھیں۔ ان کی شخصیت میں دہلوی تہذیب رچی بسی تھی۔ شعلہ و شبنم کے مشترکہ خمیر سے ان کی تشکیل ہوئی تھی۔ ان کے اندر شرافت و شائستگی بھی تھی اور مخالفین کو بہترین گالیوں سے نوازنے کا سلیقہ بھی۔ اگر کوئی شائستگی سے گفتگو کرتا تو وہ بھی اسی انداز میں گفتگو کرتیں۔ لیکن اگر کوئی ذرا بھی سر اٹھاتا تو انھیں سرکوبی کرنا بھی آتا تھا۔ وہ حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ بارعب بھی تھیں۔ بڑے بڑے جی دار مرد بھی ان سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے کہ پتہ نہیں کب شعلۂ حسن انھیں خاکستر کر دے۔ جن دنوں وہ دہلی کی گلیوں میں اسکوٹر سے چلا کرتی تھیں کوئی مسلم خاتون اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جتنی اچھی زبان بولتی تھیں اتنی ہی اچھی تحریر بھی لکھتی تھیں۔ شستگی اور شگفتگی نام کی دو بہنیں جیسے ان کے گھر کی باندی تھیں۔ بڑا اچھا ادبی ذوق تھا۔ دہلی میں انھیں اردو صحافت کی خاتون اول کہا جاتا ہے۔ ان سے پہلے کبھی کوئی قابل ذکر خاتون یہاں کے صحافتی منظرنامہ پر نہیں ابھری اور ان کے بعد بھی نہیں۔ لیکن ان کی ذاتی زندگی بڑی غیر منظم تھی۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ انفرادی زندگی کی ناہمواریوں سے تو واقف تھیں مگر ازدواجی زندگی کے پر کیف نشیب و فراز سے ناآشنا تھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد میں ان کی زندگی کی شمع جیسے بجھی بجھی سی نظر آتی اور وہ خود بے نور ہو گئی تھیں۔

اخبار ''جمعہ'' میں اسٹالوں پر دیکھا کرتا اور کبھی کبھار خرید بھی لیتا۔ مٹیا محل کی گلی گڑھیا

میں واقع اعظمی ہوٹل کے مالک محمد عرفان اس اخبار کے مالک تھے۔ اس میں ظفر زاہدی محفوظ صاحب کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ کئی بار طبیعت مچلی کہ اس اخبار کا دفتر دیکھنا چاہیے۔ لیکن میں نووارد صحافت بھی تھا اور ایک طرح سے نووارد دہلی بھی۔ کسی سے شناسائی نہ کسی سے راہ ورسم۔ جاتا بھی تو کیسے اور کس کے ساتھ۔ یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ جس جگہ سے نکل رہا ہے وہ کہاں ہے۔ بہر حال ایک بار کسی کے ساتھ اس کے دفتر گیا۔ مگر اس وقت وہاں ایک دو لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ اخبار کے چل چلاؤ کے دن تھے۔ کچھ دنوں کے بعد واقعی ہفت روزہ اخبار ''جمعہ'' نے اپنی آخری سانس لے لی۔

اس اخبار کے بند ہونے کے کچھ دنوں کے بعد محفوظ الرحمٰن صاحب نے ایک ہفت روزہ شروع کیا جس کا نام ''اپنا ہفت روزہ'' تھا۔ میگزین سائز پر بہت اچھا پرچہ تھا۔ جلال الدین اسلم اس کی سیٹنگ کیا کرتے تھے۔ رسالے کے صفحات ان کی فنکاری کے گواہ بن گئے۔ غالباً معصوم مرادآبادی ایک روز مجھے محفوظ صاحب کے گھر لے گئے۔ صحافت کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد معصوم پہلے صحافی تھے جن سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ پہلے اخبار نو ہی میں کام کرتے تھے۔ وہ بہت اچھے کاتب اور آرٹسٹ تھے اور اخبار سیٹ کیا کرتے تھے۔ بعد میں وہ ہفت روزہ ''نئی دنیا'' چلے گئے۔ اس کے مالک و مدیر شاہد صدیقی صاحب نے جب دیکھا کہ ان کے اندر لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بھی ہے اور جذبہ بھی تو انھوں نے انھیں ایڈیٹوریل میں شفٹ کر دیا۔ وہ سیاست دانوں کے انٹرویو لیتے اور مختلف مقامات کے دورے کر کے رپورٹنگ کرنے لگے۔ نئی دنیا کا دفتر صحافت کی دنیا میں ان کے لیے ایک لانچنگ پیڈ ثابت ہوا۔ آج وہ ملک گیر شہرت کے ایک کامیاب اور معتبر صحافی مانے جاتے ہیں۔

محفوظ الرحمٰن صاحب ان دنوں پرانی دہلی کے چتلی قبر اور ترکمان گیٹ کے درمیان واقع چھتہ موم گران میں رہتے تھے۔ چھتے کی گلی میں گھستے ہی کچھ دور چل کر ٹی پوائنٹ آتا اور ٹی پوائنٹ پر واقع دروازہ ان کے مکان کا تھا۔ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹی سی گیلری تھی جو ایک اور دروازے پر جا کر ختم ہوتی۔ وہ دروازہ ایک آنگن میں کھلتا جس کی بائیں جانب ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ایک بیڈ، ایک صوفہ، ایک میز اور چند کرسیاں لگی ہوتی تھیں۔

بیڈ پر محفوظ صاحب کمر کے بل نیم دراز ہوتے۔ آنگن کے مغرب میں ایک دوسرا کمرہ تھا جس میں ان کے بچے رہتے۔ دائیں جانب بھی ایک دروازہ تھا جو گیلری کے مساوی بنے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس کمرے میں ایک اور دروازہ تھا جو گلی میں پہلے والے دروازے کے برابر کھلتا تھا۔ لیکن وہ کمرہ اور وہ دروازہ بہت کم استعمال میں آتے۔ خاص مواقع ہی پر ان کا استعمال ہوتا۔ محفوظ صاحب کے کمرے کے دروازے پر ایک کرسی رکھی رہتی جس کا مصرف مجھے بہت بعد میں سمجھ میں آیا۔ مصرف یہ تھا کہ جو لوگ جوتا اتار کر کمرے میں جا رہے ہیں وہ واپس جاتے وقت اسی کرسی پر بیٹھ کر جوتے کے فیتے باندھ سکیں۔ یہ کرسی ہمیشہ وہیں رہی۔ میں نے وہ جگہ کبھی خالی نہیں دیکھی۔

پہلی ملاقات میں محفوظ صاحب بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ جاتے وقت یہ ہدایت دی کہ آتے جاتے رہا کرو۔ اخبار نو کا دفتر ترکمان گیٹ پر واقع تھا جو وہاں سے بمشکل تین چار منٹ کی مسافت پر تھا۔ میں اکثر و بیشتر اخبار نو سے نکلتے وقت ان کے گھر چلا جاتا۔ چونکہ اس وقت تک میری فیملی دہلی نہیں آئی تھی اس لیے گھر جانے کی کوئی بہت جلدی نہیں ہوتی۔ دھیرے دھیرے ان سے راہ و رسم بڑھنے لگی۔ وہ ہمیشہ چھوٹوں کی ہمت افزائی کرتے۔ انھوں نے میری بھی بڑی ہمت افزائی کی۔

محفوظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت بڑی بارعب اور طبیعت 'ہمہ شیشہ، ہمہ بادہ، ہمہ مینا، ہمہ جام' کی سی تھی۔ لمبا قد، بھرا بھرا مگر سڈول جسم، چھوٹی مگر خوبصورت داڑھی کے ساتھ بڑا سا چہرہ۔ ہلکی مونچھیں۔ سر پر پیچھے کی طرف جاتے ہوئے بڑے بڑے بال۔ متبسم گفتگو کرتے۔ گھر پر سفید کرتا پائجامہ میں ہوتے۔ باہر نکلتے تو سفاری سوٹ میں ہوتے۔ میں نے انھیں کبھی کسی دوسرے لباس میں نہیں دیکھا۔ گھر پر رہتے ہوئے بھی ان کے لباس سے ہمیشہ ایسا لگتا کہ وہ گھر پر نہیں دفتر میں ہیں۔ بیڈ پر کبھی دائیں کروٹ ہو جاتے تو کبھی بائیں۔ جب تھک جاتے تو کچھ دیر کے لیے اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ ان کے گھر پہنچنے پر سلام کلام کے بعد سب سے پہلے چائے آتی۔ اکثر اوقات ''میری گولڈ'' کے بسکٹ بھی ساتھ میں ہوتے۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں اخبار نو چھوڑ دیا۔ شاہد صدیقی

کے بھتیجے اور ماہنامہ ''ہدیٰ'' کے ایڈیٹر اور مالک احمد مصطفیٰ صدیقی راہی کے بیٹے احمد سہیل صدیقی نے ''ہمارا قدم'' نام سے ایک بہت اچھا ہفت روزہ اخبار نکالا۔ وہ روزنامہ سائز پر چھپتا۔ ٹائٹل اور اس کے بیک کے اور آخری صفحہ اور اس کے بیک کے صفحات فور کلر میں ہوتے۔ انھوں نے بھوگل بازار میں اخبار کا دفتر بنایا تھا۔ بہت اچھی تنخواہ دے کر ایڈیٹوریل ٹیم بنائی تھی۔ اس وقت اخبار نو میں میری تنخواہ پندرہ سو روپے تھی جو سات سو سے بڑھ کر وہاں تک پہنچی تھی۔ اس وقت سات سو بھی کم نہیں تھی۔ احمد سہیل صدیقی نے ڈھائی ہزار روپے تنخواہ پر رکھا۔ اس اخبار نے دھوم مچادی۔ اس کی سرکولیشن تقریباً ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ان کے یہاں کام کے اوقات کا کوئی ضابطہ نہیں تھا۔ اگر کام ہے تو رات کے بارہ ایک بجے تک بھی کام کرنا پڑتا۔ لیکن تھے شاہ خرچ۔ خوب خرچ کرتے اور رات میں رکنے والے کارکنوں کو بہت اچھا کھانا کھلاتے۔ لیکن کام بھی اسی طرح لیتے۔ وہیں میں نے جہازی سائز کی افغانی روٹیاں دیکھیں۔

محفوظ صاحب کو علم ہوا کہ میں نے اخبار نو چھوڑ دیا ہے تو انھوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اخبار نو کے پندرہ سو روپے کے مقابلے میں ڈھائی ہزار روپے مل رہے ہیں تو اطمینان کا اظہار کیا۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس اخبار میں کچھ دنوں کے بعد میری حیثیت ایک طرح سے ایڈیٹر انچارج کی ہو گئی ہے تو انھیں اور بھی اچھا لگا۔

اسی درمیان میرٹھ و ملیانہ میں بدترین نوعیت کے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے۔ بہت سی مسلم تنظیموں اور جماعتوں نے مسلم مظلومینِ میرٹھ و ملیانہ کا جھنڈا اٹھالیا تھا۔ ان کے ذمہ دار خود کو ان کا سب سے بڑا ہمدرد ظاہر کرتے اور اہل خیر حضرات کے سامنے دامن پھیلا کر متاثرین کے لیے امداد کی بھیک مانگتے جو در اصل نام تو مسلمانان میرٹھ و ملیانہ کا لیتے مگر جیب اپنی بھرتے، بینک بیلنس اپنا بڑھاتے۔ اس وقت آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر ممبر پارلیمنٹ سید شہاب الدین تھے۔ مشاورت نے بھی متاثرین کے نام پر چندے کیے۔ جو خطیر رقم اکٹھا ہوئی اسے بینک میں جمع کر دیا گیا اور اس سے ملنے والے سود سے مشاورت کے اخراجات پورے کیے جانے لگے۔ یہ نہیں معلوم کہ اس رقم میں سے مظلومین میرٹھ و ملیانہ کو کچھ حاصل ہوا یا نہیں۔ (ایک حالیہ اخباری رپورٹ کے مطابق میرٹھ کی ایک سرکردہ مسلم شخصیت کو مقدمہ لڑنے کے لیے اس

میں سے پیسے دیے جاتے تھے)۔ محفوظ صاحب بھی مشاورت میں تھے۔ انھوں نے اس طریقہ کار کی مخالفت کی۔ وہ اس بات پر زور دیتے کہ جو رقم مظلوموں کے نام سے حاصل کی گئی ہے اس پر کسی اور کا حق نہیں ہے وہ ہر حال میں انھیں ملنی چاہیے۔ وہ اسے بینک میں جمع کر کے اس سے ملنے والے سود سے مشاورت کے اخراجات پورے کرنے کے سخت مخالف تھے۔ لیکن ان کی اپیلوں اور احتجاجوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

انھی دنوں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا دہلی کے ایوان غالب میں ایک دو روزہ کنونشن ہونے والا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ محفوظ صاحب نے بینک کی پاس بک کی فوٹو کاپی حاصل کی۔ رقوم کی حصولیابی، بینک میں جمع رقم اور اس پر ملنے والے سود کی تفصیلات یکجا کر دیں۔ انھوں نے اس پورے معاملے پر ''اپنا ہفت روزہ'' کا ایک خصوصی شمارہ نکالنے کی پلاننگ کر لی۔ اس کا نام انھوں نے ''خیانت نمبر'' رکھا۔ جس میں انھوں نے ملت کے نام پر حاصل کی گئی رقوم میں ''خیانت'' کی نقاب کشائی کی تھی۔ انھوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ ۱۵ تا ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۲ کا شمارہ جو چالیس صفحات پر مشتمل تھا ''خیانت نمبر'' کے نام سے نکالا۔ جس کے ٹائٹل پر ''میرٹھ، ملیانہ، ریلیف فنڈ، بابری مسجد'' لکھا ہوا تھا اور اس پر ایک پنجہ حملہ آور تھا۔ نیچے پر ''مشاورت سنڈی کیٹ'' لکھا ہوا تھا۔ انھوں نے کنونشن کے پہلے روز ہی ایوان غالب میں اسے تقسیم کرا دیا۔ خدا کی پناہ۔ زبردست ہنگامہ ہوا۔

اپنا ہفت روزہ کی اشاعت بڑھنے لگی۔ ایک روز باتوں باتوں میں انھوں نے کہا: ''اگر میرے پرچے کی سرکولیشن دس ہزار تک پہنچ جائے تو میں آپ کو کہیں اور نوکری کرنے نہیں دوں گا یہیں بلا لوں گا''۔

لیکن سرکولیشن دس ہزار تک کبھی نہیں پہنچی۔ ادھر میں ان کے ساتھ کام کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ ایک روز جانے کیا سوجھی میں نے سہیل صدیقی سے کہا: ''میں اب آپ کے اخبار میں کام نہیں کروں گا''۔

ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ بہت سے کاموں کے ساتھ ساتھ اخبار کی لیڈ اسٹوری بھی میں ہی لکھتا تھا۔ وہ نا سننے کے عادی نہیں تھے۔ انھیں اس کی توقع نہیں تھی کہ یہ لڑکا

جسے انھوں نے پندرہ سو کی جگہ پر ڈھائی ہزار روپے پر رکھا ہے یہاں سے یوں چلا جائے گا۔ وہ اس خیال میں تھے کہ میں اپنے کارکنوں کو اچھی تنخواہ دیتا ہوں کوئی میرے یہاں سے کیوں جائے گا۔ کچھ لمحوں کے لیے ان کی زبان گنگ ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے بڑی ناگواری کے ساتھ آہستہ سے پوچھا: ''کیوں کیا ہو گیا۔ آپ یہاں سے کیوں جانا چاہتے ہیں۔ یہاں آپ کو کیا پریشانی ہے''۔

''نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے''۔

''پھر کیوں جا رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں''۔

''میں محفوظ صاحب کے پرچے میں کام کرنا چاہتا ہوں''۔ میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''ارے نہیں آپ کو ہم جانے نہیں دیں گے۔ چلیے کام کیجیے بعد میں بات کریں گے''۔

میں تو خاموش ہو گیا مگر ذہن میں جو ایک کیڑا کلبلانے لگا تھا وہ خاموش نہیں ہوا۔ وہ مسلسل مجھے اکساتا رہا۔ حالانکہ نہ تو محفوظ صاحب نے مجھے بلایا تھا اور نہ ہی ان کے رسالے کی سرکولیشن دس ہزار ہوئی تھی۔ لیکن جانے کیا خبط سوار ہو گیا تھا کہ ہمارا قدم میں اب دل ہی نہیں لگتا۔ دو چار روز کے بعد میں نے پھر موقع دیکھ کر سہیل صدیقی کے سامنے جانے کی رٹ لگا دی۔ ان کی پیشانی پھر شکن آلود ہو گئی۔ میں ان سے نظر ملا کر بات کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ انھوں نے پوچھا: ''کیا یہاں تنخواہ کم ہے۔ کہیے تو تنخواہ بڑھا دوں''۔ اس بار ذرا تیز آواز میں انھوں نے کہا۔

''نہیں تنخواہ کی کوئی بات نہیں ہے''۔

''پھر کیا بات ہے آپ بتاتے کیوں نہیں''۔

''محفوظ صاحب اپنے یہاں کام کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں''۔ میں نے جب بچنے کی کوئی صورت نہیں دیکھی تو جھوٹ بول دیا۔ حالانکہ انھوں نے کبھی مجھے اپنے رسالے میں کام کرنے کی باضابطہ پیشکش نہیں کی تھی۔

یہ محفوظ صاحب کے نام کا دبدبہ تھا یا کیا تھا کہ سہیل صدیقی نے خاموشی اختیار کر لی۔ انھوں نے بڑی روکھائی سے کہا: ''ٹھیک ہے اپنا حساب لے لیجیے اور جائیے''۔

میں ہمارا قدم سے نکل کر سیدھے محفوظ صاحب کے گھر گیا۔ وہ گھر پر نہیں تھے۔ معلوم

ہوا کہ وہ ٹیا محل مولانا احمد علی قاسمی کے گھر گئے ہوئے ہیں جو کہ اس وقت مسلم مجلس مشاورت کے جنرل سکریٹری تھے۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ سلام کلام کے بعد ہم لوگ پہلی منزل سے نیچے آئے۔ محفوظ صاحب نے پوچھا: ''سہیل انجم صاحب یہاں تک کیسے آنا ہوگیا''۔

''میں کشتی جلا کے آرہا ہوں''۔ میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''۔

''میں نے ہمارا قدم چھوڑ دیا''۔

''کیوں؟ کیا انھوں نے نکال دیا''۔

نہیں میں خود نکل گیا''۔

''کیا وجہ ہوگئی کیوں نکل گئے''۔

''میں آپ کے پرچے میں کام کروں گا''۔ میں نے نگاہیں نیچی کر کے عرض مدعا کر دیا، یہ سوچے بغیر کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

اس بار محفوظ صاحب پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ کچھ دیر کے بعد ان کے حواس بحال ہوئے۔ کہنے لگے آیئے گھر چلتے ہیں۔ اس طرح اگلے روز سے میں ان کے رسالے میں کام کرنے لگا۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انھوں نے میری لاج رکھ لی۔ ورنہ وہ کہہ سکتے تھے کہ ابھی تم کو رکھنے کی میری بساط نہیں ہے یا مجھے تمھاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ اگر مجھے محفوظ صاحب کے مزاج اور ان کے حالات کا علم ہوتا تو میں ہرگز یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتا۔ بلکہ وہ بلاتے جب بھی ان کے میگزین میں کام نہیں کرتا۔ محفوظ صاحب ایک قلندر آدمی تھے۔ کہیں سے بجٹ کا انتظام ہوگیا تو رسالہ نکال دیا ورنہ اللہ اللہ خیر صلا۔ کہیں ملازمت ہے یا نہیں ہے، کوئی رسالہ نکال رہے ہیں یا نہیں نکال رہے ہیں۔ کسی بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ گھر کے اخراجات کیسے چلیں گے انھیں اس کی بھی کوئی چنتا نہیں تھی۔ وہ عقیدے کے اتنے پختہ تھے کہ گھبراہٹ یا مستقبل کی پیشگی منصوبہ بندی کرنا ان کے مزاج ہی میں نہیں تھا۔ کہتے تھے کہ روزی کا ذمہ اللہ نے لیا ہے وہی انتظام کرے

گا۔ اکثر کہا کرتے کہ ارے کس بات کی فکر ہے۔ دو وقت کی روٹی اور سر پر چھت چاہیے۔ اس سے زیادہ کی کیا ضرورت ہے۔

اور اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کے لیے اس کا انتظام ہر حال میں کرتا رہتا تھا۔ بہت دنوں تک میں اس راز کی ٹوہ میں رہا کہ آخر ان کے گھریلو اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔

محفوظ صاحب نے اپنا ہفت روزہ کا دفتر پرانی دہلی میں چاندنی محل کی ایک گلی کے آخری سرے پر واقع ایک مکان میں دو کمروں کی ایک جگہ کرائے پر لے کر قائم کیا تھا۔ قومی آواز کے کاتب عبدالکریم اس وقت اس کو سیٹ کیا کرتے تھے۔ محفوظ صاحب دفتر نہیں جاتے۔ صبح کو آتے وقت میں پہلے ان کے گھر جاتا اور پھر دفتر جاتا۔ شام کی واپسی بھی ایسے ہی ہوتی۔

اس وقت محفوظ صاحب بابری مسجد پر ایک دستاویزی شمارہ نکالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں اس کی تیاری میں لگ گیا۔ انھوں نے پرنٹ لائن پر اپنے نام کے ساتھ میرا بھی نام دیا اور اس کے آگے ''اسسٹنٹ ایڈیٹر'' لکھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ محفوظ صاحب کے رسالے میں میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں۔ میں نے تو خیر کم لیکن انھوں نے بہت محنت کی۔ بہت شاندار نمبر نکالا گیا جو واقعی دستاویزی تھا۔ اس میں ہندی کے معروف ادیب کملیشور کی ایک کتاب ''سلگتے شہر کا سفرنامہ'' سے کئی صفحات لیے گئے تھے جو در اصل اجودھیا کا ان کا سفرنامہ تھا اور جس میں انھوں نے حقائق کی روشنی میں وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کے دعووں کو مسترد کیا تھا۔ ایک سرکردہ غیر مسلم مورخ کا ایک بہت اچھا مضمون بھی اس میں شامل تھا۔ اس میں بھی تاریخی شواہد کی روشنی میں بابری مسجد کے کیس کی پیروی کی گئی تھی۔ اس وقت تک بابری مسجد کا انہدام نہیں ہوا تھا۔ ٹائٹل ایک آرٹسٹ سے بنوایا گیا تھا۔ اس نے بابری مسجد کی تصویر بنائی تھی جس پر آسمان سے بجلی گر رہی تھی۔ یہ محفوظ صاحب کا آئیڈیا تھا جو بعد میں حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔ اس نمبر میں متعدد مسلم شخصیات اور سیاست دانوں کے انٹرویوز بھی تھے جن میں سے کئی انٹرویو میرے کیے ہوئے تھے۔ اس نمبر کی علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

لیکن رسالے کی اشاعت کم ہوتی گئی اور جلد ہی اس کے بند ہونے کی نوبت نظر آنے لگی۔ شروع میں تنخواہ ملی مگر پھر اس میں تاخیر ہونے لگی۔ اس وقت تک میں اپنی فیملی بھی دہلی لے

آیا تھا۔لیکن چونکہ میرے اندراتنا اطمینان نہیں تھا جتنا محفوظ صاحب کے اندر تھا اس لیے تنخواہ میں تاخیر پر تشویش بجا تھی۔ایک موقع ایسا آیا جب فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔میں نے محفوظ صاحب سے کہا۔انھوں نے اگلے روز بلایا۔کہیں سے کچھ انتظام ہو گیا تھا۔انھوں نے ۹۰۰ روپے دیتے ہوئے کہا: ''کچھ انتظام ہو گیا ہے۔جس میں سے کچھ میں رکھتا ہوں کچھ آپ رکھیے''۔

میں وہ ''خطیر رقم'' لے کر بس سے گھر جا رہا تھا کہ رقم جیب کتروں کی نذر ہو گئی۔'کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے' کا ورد کرتا ہوا جب میں گھر پہنچا تو چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔میری اہلیہ نے سمجھ لیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔میں نے واقعہ بتایا۔وہ بھی پریشان ہوئیں مگر پھر تسلی دینے لگیں کہ اللہ کچھ انتظام کرے گا۔گھر میں چولہا جلانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔محفوظ صاحب کے رسالے میں سرکولیشن کا کام دیکھنے والے شمس الدین اچانک مغرب کے بعد آگئے۔انھوں نے پریشان دیکھا تو سوال کر لیا۔میں نے صورت حال بتادی۔وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ایک گھنٹے کے اندر اندر دوبارہ آئے۔ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں کچھ آٹا اور آلو پیاز وغیرہ تھے۔اس طرح اللہ نے واقعی انتظام کر دیا تھا۔

لیکن اپنا ہفت روزہ کے حالات بدلے نہ میرے۔ظاہر ہے محفوظ صاحب کے بھی حالات اچھے نہیں تھے۔رسالہ بند کرنے کا اعلان تو نہیں ہوا تھا مگر آثار اسی کے تھے۔میں کہیں سے قرض وغیرہ لے کر گھر کے اخراجات پورے کرتا۔اس وقت ہم دو میاں بیوی کے علاوہ دو بچے بھی تھے۔کئی دنوں تک یہی عالم رہا۔جب راشن پانی کے انتظام کی کوئی صورت نہیں رہی تو میری ذہنی حالت کیسی ہو گئی ہو گی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ایک روز میں دفتر پہنچا۔وہاں شمس الدین بھی تھے۔ان سے باتیں ہونے لگیں۔میں جلا بھنا بیٹھا تھا۔بولنا شروع کر دیا۔کسی نے مجھے بتایا تھا کہ محفوظ صاحب جس مکان میں رہتے ہیں وہ ان کا نہیں ہے۔جب وہ جماعت اسلامی ہند کے اخبار ''دعوت'' کے ایڈیٹر تھے تو انھیں رہائش کے لیے وہ مکان ملا تھا جسے انھوں نے ملازمت ختم ہونے کے بعد خالی نہیں کیا۔یہ بات میرے دل و دماغ میں اچھلنے لگی۔میں نے شمس الدین کو مخاطب کر کے (وہ اس وقت محفوظ صاحب کے چہیتے تھے) بڑبڑانا شروع کر دیا کہ جب میگزین نکالنے کے پیسے نہیں ہیں تو کیوں نکال رہے ہیں، ہم لوگوں کا حساب کر کے بند کیوں نہیں

کر دیتے۔ لگے ہاتھوں میں نے مکان کے سلسلے میں بھی دو چار باتیں کہہ دیں کہ میں نے ایسا اور ویسا سنا ہے۔

دل کا غبار نکل گیا تو میں خاموش ہو گیا۔ ''غبار دل نکل گیا سکون ہی سکون ہے''۔

کچھ دیر کے بعد محسوس ہوا کہ شمس الدین آفس میں نہیں ہیں۔ کام وام تو کچھ تھا نہیں۔ میں بھی اٹھا اور یہ سوچ کر کہ شاید کچھ پیسوں کا کہیں سے انتظام ہوا ہو محفوظ صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کے گھر پیسہ میرا انتظار نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک بہت بڑا طوفان میرا منتظر ہے۔

میں ان کے گھر گیا۔ وہاں کا ماحول انتہائی خراب تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ خود بھی بیڈ سے اتر کر وہیں آ گئے اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر زبردست ناگواری کے تاثرات تھے۔ غصے سے جسم کانپ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی طوفان آ کر گزر گیا ہے مگر اپنی تباہی کے نشانات چھوڑ گیا ہے۔

انھوں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا: ''ہاں صاحب ذرا بتائیے کہ میں نے کس کا مکان ہڑپ لیا ہے اور کس کے پیسے مار لیے ہیں؟''۔

فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے پھر وہی جملہ دوہرایا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ وہ انتہائی غصے کے عالم میں جانے کیا کیا بولتے رہے۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ چیر و تو جسم میں خون نہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری قوت سماعت ختم ہو گئی ہو۔ قوت گویائی کو بھی جیسے لقوئہ مار گیا ہو۔ نہ تو ان کی کوئی بات سمجھ میں آ رہی تھی اور نہ میں کچھ کہہ پا رہا تھا۔ ہاں ان کا یہ جملہ ضرور میں سمجھ گیا اور پھر پوری صورت حال واضح ہو گئی۔

''آپ نے میرے بارے میں جو کچھ کہا کہا، مگر ایسے آدمی کے سامنے کہا جواب جا کر پوری دہلی میں ڈھنڈورا پیٹے گا''۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ کس گفتگو اور کس شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ شمس الدین ان کے بہت چہیتے تھے لیکن وہ انھیں سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے ان کے سامنے جو کچھ کہا ہے وہ دوسری محفلوں میں ان کا پرچار کریں گے۔ اور اگر ایسا ہوا

تو ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔

جب بات میری سمجھ میں آ گئی تو میں نے صرف اتنا کہا: ”دراصل گھر میں فاقہ کشی کی نوبت ہے۔ ایسے میں دل و دماغ ٹھکانے پر نہیں۔ تنخواہ مل نہیں رہی ہے۔ اس لیے میں نے کچھ باتیں اشتعال میں آکر کہہ دیں۔ لیکن مجھے اس کا بہت افسوس ہے اور میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں“۔

لیکن ان کا غصہ کسی طور ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ بار بار یہی کہے جا رہے تھے کہ اب وہ شخص پوری دہلی میں ڈھنڈورا پیٹے گا۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ بول چکے تو انھوں نے مجھے اپنے گھر سے بھگا دیا۔ میں اگلے روز پھر ان کے گھر پہنچ گیا۔ چھوٹی بیٹی نے دروازہ کھولا۔ مگر اس نے اندر آنے کو نہیں کہا۔ شاید کچھ ہدایت مل گئی تھی۔ محفوظ صاحب دروازے پر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑے۔

”آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرے دروازے پر آنے کی؟ کیوں آئے ہیں آپ؟ جائیے یہاں سے اور فوراً جائیے“۔

ابھی بھی ان کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ البتہ اب لہجے میں وہ تلخی نہیں تھی جو ایک روز قبل دیکھنے کو ملی تھی۔ میں نے ہمت کر کے کہا: ”مجھے اپنے رویے پر بہت شرمندگی ہے۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ جب تک آپ معاف نہیں کر دیں گے میں واپس نہیں جاؤں گا“۔

”نیند تو مجھے بھی نہیں آئی۔ لیکن آپ اس وقت جائیے۔ میں کوئی بات نہیں کر سکتا“۔

اور انھوں نے میرے منہ پر دروازہ بند کر دیا۔ دو تین روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ میں جاتا۔ دروازے پر بات ہوتی۔ اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ دونوں اپنی اپنی بات کہتے اور دروازہ بند ہو جاتا۔ مجھے اس بات کی زیادہ فکر نہیں تھی کہ محفوظ صاحب سے تعلقات خراب ہو گئے۔ کیونکہ اس وقت تک میں ان کو اور ان کے مزاج کو جانتا نہیں تھا۔ فکر اس بات کی زیادہ تھی کہ اگر آنا جانا بند ہو گیا تو میری ملازمت کا کیا ہوگا۔ کہاں جاؤں گا، کیا کروں گا۔ کیونکہ اب تو یہ نوکری گئی ہاتھ سے اور دو تین مہینے کی جو تنخواہ باقی ہے وہ بھی ماری گئی۔

دو چار روز کے ناغے کے بعد میں پھر گیا۔ اب طوفان باد و باراں کی علامتیں ختم ہو گئی

تھیں۔ شاید ان کو بھی مجھ پر ترس آ گیا کہ یہ کہاں جائے گا، کیا کرے گا۔ بچے ساتھ میں ہیں ان کا کیا ہوگا۔ اب مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح ہم دونوں کئی روز تک جس ذہنی کشمکش سے دو چار تھے اس سے نجات ملی۔ مجھے تو مل گئی تھی شائد ان کو بھی مل گئی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس افسوسناک واقعہ کے بعد ان کے گھر آنا جانا بڑھ گیا اور ان کے ساتھ تعلقات بھی پہلے کے مقابلے زیادہ مستحکم ہو گئے۔ ایک روز انھوں نے رسالہ بند کرنے کا وہ اعلان کر دیا جو تلوار کی مانند بہت دنوں تک سر پر لٹکتا رہا تھا۔ میں سڑک پر آ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اپنا ہفت روزہ بند ہو گیا۔

ادھر شائد احمد سہیل صدیقی کو میرا کوئی متبادل نہیں مل پایا تھا۔ ان کو خبر لگ گئی کہ "اپنا ہفت روزہ" بند ہو گیا ہے۔ انھوں نے مجھے بلوایا اور پھر نوکری پر رکھ لیا۔ اس بار انھوں نے میری تنخواہ ڈھائی ہزار کی جگہ پر چار ہزار کر دی۔

اس درمیان محفوظ صاحب نے ایک بار پھر رسالہ نکالنے کا ڈول ڈالا۔ انھوں نے "بادبان" نام سے ایک ماہنامہ رسالہ شروع کیا۔ لیکن وہ بھی کچھ دنوں تک نکل کر بند ہو گیا۔ محفوظ الرحمٰن صاحب بہت ہی خوددار اور غیرت مند تھے۔ اپنی عزت نفس پر کسی بھی قسم کی آنچ ان کو گوارہ نہیں تھی۔ فاقے کرنا منظور تھا مگر اپنے اصولوں سے سرِ مو انحراف منظور نہیں تھا۔ وہ دنیاداری کے تقاضوں سے ناواقف تھے۔ موجودہ دور میں صحافیوں کی جماعت کس طرح کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے مگر ان کو یہ فن نہیں آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صحافت کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ نہ دنیاداری نہ خانہ داری۔ لیکن جس بات کو سچ سمجھتے تھے اسے ڈنکے کی چوٹ پر لکھتے تھے۔ خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض۔

صحافت کے ابتدائی دنوں میں ان کی ملاقات ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی سے ہوئی۔ انھوں نے "قائد" نام سے اپنا اخبار شروع کیا تھا۔ محفوظ صاحب پہلے اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے بعد میں ایڈیٹر ہو گئے۔ شاید فریدی صاحب کی شخصیت نے بھی ان کی اپنی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔ اسی لیے ان کے اندر بھی ایک بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔

بعد میں جب وہ دہلی آئے اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اور مختلف جگہوں پر کام کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے اخبار دعوت پہنچے تو ان کے اندر ملی جذبات کو مہمیز لگی اور ان کی

صحافت جو پہلے ہی ملی فکر کے محور پر گردش کرتی تھی اب اور پختہ ہوگئی۔ اس وقت دعوت کے ایڈیٹر محمد مسلم صاحب تھے جو ان کو بہت مانتے تھے۔ دونوں میں بہت گہرے تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات وخیالات کی قدر کرتے۔ وہاں ان کی ملاقاتیں بہت سے علماء سے ہوتیں۔ شاید وہیں سے روایتی اور نام نہاد علماء کے بارے میں ان کی رائے خراب ہوئی، جو پہلے بھی خراب رہی ہوگی مگر اب اس کی دھار تیز ہوگئی۔

وہ ملی معاملات میں کسی کو بھی نہیں بخشتے۔ یہاں تک کہ جید علما کے فیصلوں کے بارے میں بھی اگر ان کو لگتا کہ وہ ملی مفاد میں نہیں ہیں تو اپنی تحریروں میں ان فیصلوں کی بھی دھجیاں بکھیر دیتے۔ وہ روایتی علما کی روش کے بہت شاکی تھے۔ ملی قیادت سے بھی بدظن رہا کرتے۔

جب شاہ بانو کیس کے ہنگامے کے بعد ''مسلم مطلقہ قانون'' پارلیمنٹ سے منظور ہوا تو اس کے خلاف ان کا قلم چل پڑا۔ ان کی دلیل تھی کہ یہ قانون اسلامی شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں ایسی خامیاں ہیں کہ اس قانون کے بعد بھی شریعت میں مداخلت والے فیصلے ہوں گے۔ ان کی یہ بات سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ بعد میں ملکی عدالتوں سے ایسے کئی فیصلے ہوئے جو اسلامی شریعت سے متصادم تھے۔

وہ کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ میں نے اگر ان کی گفتگو میں کسی کی کردار کشی کا انداز نہیں دیکھا تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کسی کی شان میں بلاوجہ قصیدے پڑھ رہے ہوں۔ ہاں۔ وہ تین شخصیات سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور جب بھی ان میں سے کسی کے بارے میں گفتگو چھڑتی تو ان کا انداز بڑا والہانہ ہو جاتا۔ گفتگو کے دوران ان کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات پیدا ہو جاتے، دبا دبا سا جوش جھلکنے لگتا اور ایسا لگتا کہ ان شخصیات سے ان کو جو قلبی تعلق رہا ہے وہ کسی اور سے نہیں رہا۔ پہلی شخصیت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی تھی، دوسری مولانا محمد عثمان فارقلیط کی تھی اور تیسری محمد مسلم کی تھی۔ فریدی صاحب اور مسلم صاحب کے ساتھ انھوں نے کام کیا تھا۔ البتہ فارقلیط صاحب کے ساتھ انھوں نے کام نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کے ملی جذبے اور ان کی بااصول صحافت نے انھیں اپنا مرید بنالیا تھا۔ ان ہی کی ہدایت پر ''اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن'' نے صحافت کے شعبے میں مولانا محمد عثمان فارقلیط ایوارڈ کا اعلان کیا تھا اور حسن اتفاق کہ اس نام کا

پہلا ایوارڈ خاکسار کو ملا۔

ڈاکٹر فریدی کے بارے میں انھوں نے بہت سے واقعات سنائے تھے بلکہ جب بھی ذکر چھڑ جاتا تو نئے نئے واقعات سننے کو ملتے۔ ڈاکٹر فریدی ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ وہ روزانہ کچھ مریضوں کو فیس لے کر دیکھتے اور کچھ غریب مریضوں کو مفت دیکھتے۔ اس کے لیے اوقات کار متعین تھے۔ محفوظ صاحب کی روایت ہے کہ وہ مریضوں کو دیکھنے کے لیے ہمیشہ کان میں آلہ STATHISCOPE لگائے رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دونوں کانوں میں گڈھے پڑ گئے تھے۔ محفوظ صاحب کا کہنا ہے کہ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یومیہ اتنے مریض کیوں دیکھتے ہیں کہ آپ کے کانوں میں گڈھے پڑ گئے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر فریدی نے جو جواب دیا تھا وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ بقول ان کے ''کل قیامت میں جب میرا اللہ مجھ سے پوچھے گا کہ تم نے دنیا میں کیا کیا تو میں اسے اپنے کانوں کے گڈھے دکھا کر کہوں گا کہ تیری مخلوق کی خدمت کرتا رہا جس کا ثبوت یہ گڈھے ہیں۔ اگر میری یہ خدمت تجھے منظور ہے تو اپنی رحمت سے مجھے بخش دے''۔

جب وہ قائد کے ایڈیٹر تھے تو انہی دنوں ایک بار ڈاکٹر فریدی کو الہ آباد میں رات میں ایک جلسے میں تقریر کرنی تھی۔ قائد کا دفتر لکھنؤ میں تھا۔ محفوظ صاحب نے دن ہی میں ڈاکٹر فریدی کی تقریر کو لیڈ اسٹوری بنایا جس میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ محفوظ صاحب چونکہ ان کی پالیسی اور ان کے مزاج سے واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ جس موضوع پر بولنے والے ہیں اس میں کیا کیا کہیں گے اس لیے انھوں نے اپنی طرف سے تقریر بنا کر اخبار تیار کرا دیا اور چھپنے کے لیے پریس بھجوا دیا۔ مگر رات میں یہ خبر آئی کہ شام کے وقت الہ آباد میں زبردست طوفان باد و باراں آیا جس کی وجہ سے جلسہ ملتوی ہو گیا۔ بقول محفوظ صاحب وہ بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں۔ مگر پھر اپنی حاضر دماغی سے کام لے کر انھوں نے فوراً ایک شخص کو پریس دوڑایا اور اخبار کی کاپی چھپنے سے رکوا دی۔ اس طرح ایک بہت بڑا تنازعہ بنتے بنتے رہ گیا۔

انھوں نے قائد بند ہونے کے بعد سوویت روس کے سفارت خانے میں بھی کام کیا تھا

اور پولینڈ کے سفارت خانے میں بھی۔ لیکن جب سوویت روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو انھوں نے وہاں کی ملازمت چھوڑ دی۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے: ’’میں نے سوویت روس کے سفارت خانے میں کام کر کے جو گناہ کیا تھا اس کا کفارہ میں نے بعد میں ادا کر دیا‘‘۔

میں نے پوچھا: ’’کیسے کفارہ ادا کر دیا‘‘۔

’’افغانستان پر سوویت روس کے حملے کے خلاف ایک کتاب لکھ کر‘‘۔ انھوں نے جواب دیا۔

’’لیکن میں نے تو آپ کی ایسی کسی کتاب کے بارے میں سنا اور نہ دیکھا۔ کیا اس کی ایک کاپی دیکھنے کو مل سکتی ہے‘‘۔

’’آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنی چیزیں رکھتا نہیں۔ میرا تو صرف نام ہی محفوظ ہے۔ میں کوئی چیز محفوظ کر کے رکھ نہیں پاتا‘‘۔

میں نے پھر بھی ان سے اس کتاب کا تقاضہ برقرار رکھا۔ شائد ان کو یہ محسوس ہوا کہ مجھے ان کی بات پر یقین نہیں ہے اس لیے چند روز کے بعد ان کا فون آیا اور انھوں نے کہا کہ ’’سرخ یلغار‘‘ کا ایک نسخہ مل گیا ہے۔ اب جب بھی آیئے گا تو لے لیجیے گا۔

میں نے پوچھا یہ سرخ یلغار کیا ہے تو انھوں نے بتایا کہ افغانستان پر روسی حملے کے خلاف انھوں نے جو کتاب لکھی تھی اس کا نام ہے۔ چند روز کے بعد واقعی مجھے ان کی یہ کتاب مل گئی۔

وہ اپنے سے چھوٹوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ جس وقت میں ’’ہمارا قدم‘‘ میں کام کر رہا تھا وہ میرے لیے سخت قلمی جدو جہد کا زمانہ تھا۔ سہیل صدیقی کے ایک ایکسیڈنٹ کے بعد جب اخبار بند ہو کر دوبارہ شروع ہوا تو چونکہ وہ زیادہ چل پھر نہیں سکتے تھے اور نہ ہی زینے چڑھ سکتے تھے، ہمارا قدم نظام الدین اور آشرم کے درمیان واقع جنگپورہ بھوگل میں واقع ان کے گھر سے نکلنا شروع ہوا بازار والے پرانے دفتر سے نہیں۔ مین روڈ کی جانب ان کے گھر کا مین گیٹ تھا اور پچھلی گلی میں ایک دروازہ تھا جو ایک تنگ سی لابی کے بعد ایک تقریباً دس بائی دس فٹ کے یا اس سے بھی چھوٹے کمرے میں لے جاتا تھا۔ اس میں انھوں نے دفتر بنایا تھا۔ جہاں تین چار سب ایڈیٹر اور تین چار کاتب بیٹھتے تھے اور ایک تخت پر سہیل صدیقی براجمان ہوتے۔ صبح دس بجے دفتر

کا کام شروع ہوتا جو پانچ یا چھ بجے تک چلتا۔ لیکن جس روز وہ صفحہ اول کی اسٹوری لکھواتے اس روز مجھے چھ بجے کے بعد روک لیتے اور سب کے جانے کے بعد بریف کرتے اور کہتے کہ اسے مضمون کی شکل دے دو۔ میں دن بھر کی تھکان کے باوجود مضمون مکمل کرنے پر مجبور ہوتا اور پھر پڑھ کر ان کو سنانا بھی پڑتا۔ وہ اخبار میں چھپی ہوئی موٹی موٹی سرخی تو پڑھ سکتے تھے لیکن نہ تو اردو کی باریک چھپائی پڑھ سکتے تھے نہ ہی لکھائی۔

ایک روز میں نے محفوظ صاحب سے کہا کہ ہمارا قدم میں بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ نہ سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے اور نہ ہی باہر جا کر چائے پینے کی ہی کوئی روایت ہے۔ کبھی کبھی تو لکھ لکھ کر ایسا تھک جاتا ہوں کہ گھر جانے تک کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس پر انھوں نے جو بات کہی وہ لاکھ ٹکے کی تھی اور میں نے نہ صرف یہ کہ اسے اپنی گرہ میں باندھ لیا بلکہ آگے چل کر اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔ انھوں نے میری بات سنتے ہی کہا:

"سہیل انجم صاحب یہ بات ذہن میں بٹھا لیجیے کہ اس لائن میں آپ کی جتنی رگڑائی ہوگی آپ کے قلم میں اتنی ہی چمک پیدا ہوگی۔ محنت سے گھبرایئے اور بھاگیے نہیں۔ وہ جتنی محنت آپ سے لیں آپ کیجیے۔ اس کا فائدہ آپ کو بعد میں ملے گا"۔

واقعی اس رگڑائی نے مجھ میں کام کرنے کی ایسی عادت ڈال دی کہ اگر میرے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے تو میں بیمار پڑ جاتا ہوں۔ اس کا دوسرا اور اہم فائدہ یہ ہوا کہ مجھے تھوڑا بہت ٹوٹا پھوٹا لکھنا آ گیا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پرانے والے مکان سے ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے جو کہ چتلی قبر کے چوک پر واقع مسجد کے بالمقابل تھا۔ ایک تنگ سے مگر اونچے زینہ سے چڑھ کر دوسری منزل پر واقع مکان میں منتقل ہونے کے بعد گھر سے نکلنے اور ادھر ادھر آمد و رفت کا ان کا سلسلہ جو پہلے ہی بہت محدود تھا، محدود تر ہو گیا۔

خردنوازی کی ایک مثال اور دیکھیے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کے زیر اہتمام ۹ نومبر کو منائے جانے والے عالمی یوم اردو کے موقع پر ایک یادگاری مجلہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک اداریہ بھی ہوتا ہے جس کی روایت محفوظ صاحب ہی نے شروع

کی تھی۔ وہی پہلے اداریہ لکھتے تھے جوان کے نام سے چھپتا تھا۔ مجلّہ کی تیاری بھی انھی کی زیر نگرانی ہوتی تھی۔ ۲۰۰۶ء میں جب مجلّہ تیار ہونے لگا تو انھوں نے اسے میرے سپرد کر دیا۔ خود سپرویژن کرتے رہے۔ اداریہ لکھنے کا موقع آیا تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میری طبیعت ناساز ہے میں نہیں لکھ سکوں گا۔ ہم لوگوں نے بہت اصرار کیا مگر وہ تیار نہیں ہوئے۔ عین وقت پر مجھ سے کہنے لگے: ''آپ کیوں نہیں اداریہ لکھ دیتے''۔

''میں نے کبھی لکھا نہیں ہے تو کیسے لکھ دوں اور یہ تو آپ ہی لکھتے رہے ہیں''۔

''کبھی نہیں لکھا تو کیا ہوا اب لکھو''۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے بہت محنت کر کے اداریہ لکھا اور یہ کوشش کی کہ انھی کے انداز میں لکھوں۔ اداریہ کمپوز ہو کر آیا تو انھوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں اس پر اپنی مرضی سے اپنا نام نہیں دے سکتا تھا اس لیے انھی کا نام دے دیا۔ انھوں نے دیکھا تو مسکرائے۔ کہنے لگے کہ چلیے اداریہ اس لائق ہے کہ میں اس پر اپنا نام دے سکوں۔ اس طرح انھوں نے اس پر اپنا نام دے کر میرا حوصلہ اس قدر بڑھایا کہ اگر اس پر میرا نام جاتا تو شاید اتنی خوشی مجھے نہیں ہوتی جتنی کہ ان کے نام سے چھپنے پر ہوئی۔ گویا میں ایسا لکھ سکتا ہوں جسے محفوظ صاحب اپنا مضمون کہہ سکیں۔ بعد میں بھی اکثر ایسا ہوتا کہ میرے کسی مضمون کی پذیرائی کرتے تو کہتے کہ اس کو پڑھ کر ایسا لگا جیسے میں نے ہی لکھا ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جب میں روزنامہ قومی آواز میں گیا اور میرا کوئی ڈھنگ کا مضمون اس میں شائع ہوتا تو نہ صرف یہ کہ وہ مجھے فون کر کے اس کی تعریف کرتے بلکہ دوسروں سے بھی کہتے کہ آج قومی آواز میں بہت اچھا مضمون چھپا ہے ذرا اسے پڑھیے۔ حالانکہ وہ دوسروں کے مضامین بہت کم پڑھتے تھے۔

انھی دنوں دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام صحافت پر ایک سمینار ہوا جس میں میڈیا اور معاشرہ کے موضوع پر مقالہ پڑھنے کی دعوت مجھے بھی دی گئی۔ مجھے جب بھی کوئی اچھا مضمون لکھنا ہوتا تو میں ان سے ذکر کرتا اور وہ باتوں باتوں میں ایسے پوائنٹس بتا دیتے کہ ایک مکمل اور اچھا مضمون تیار ہو جاتا۔ میں نے ان سے سمینار کا ذکر کیا اور ان سے ٹپس کی فرمائش کی۔ انھوں نے کئی

پوائنٹس بتائے اور یہ بھی کہا کہ جب لکھ لینا تو ذرا مجھے سنا دینا۔ اس وقت تک یہ ان کی عادت بن گئی تھی کہ وہ اپنا مضمون ڈکٹیٹ کراتے اور دوسروں کا مضمون پڑھوا کر سنتے۔ میں نے مضمون ان کو سنایا تو بہت خوش ہوئے۔ کہیں کہیں زبانی اصلاح بھی کی۔ اس کے بعد میڈیا کے موضوع پر میں نے کئی مضامین لکھے۔ انھوں نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ میڈیا کو اپنا موضوع بنا لیجیے۔ جب ایک درجن سے زائد مضامین ہو گئے تو انھوں نے کہا کہ اسے کتابی شکل دے دیجیے۔

اس کا نام بھی انھوں نے ہی ''میڈیا روپ اور بہروپ'' رکھا۔ کہنے لگے کہ میں نے بہت پہلے آر ایس ایس پر ایک کتاب لکھنے کا تہیہ کیا تھا اور اس کا نام میں نے ''آر ایس ایس کے روپ بہروپ'' سوچا تھا اب تو شاید وہ کتاب میں نہیں لکھ پاؤں گا لہٰذا آپ اپنی کتاب کا نام ''میڈیا کے روپ بہروپ'' رکھ لیجیے۔ بعد میں وہ نام ''میڈیا روپ اور بہروپ'' ہو گیا۔ سینئر اور بزرگ صحافی اور دانشور سعید سہروردی نے اس کا مقدمہ لکھا اور اس وقت کے قومی آواز کے ایڈیٹر موہن چراغی نے اس پر اپنے تاثرات لکھے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ چونکہ یہ کتاب محفوظؔ صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے اس لیے وہ بھی اس پر اپنے تاثرات لکھیں۔ مگر وہ ہمیشہ ٹالتے رہے۔ جب وہ کتاب پریس میں جانے والی تھی تو ایک شام ان کا فون آیا اور انھوں نے کہا کہ قلم کاغذ سنبھال لیجیے اور چند جملے لکھ لیجیے۔ انھوں نے فون ہی پر بول کر دو صفحے کا مضمون لکھوا دیا۔ جس کا پہلا پیراگراف کچھ یوں ہے:

''جواں سال صحافی سہیل انجم کی تصنیف میڈیا روپ اور بہروپ کے مسودے کے بیشتر حصے کو میں نے پڑھا ہے اور میں یہ بات پورے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فاضل مصنف نے حقائق کی تہہ تک اتر جانے کی جس غیر معمولی صلاحیت، جزرسی اور نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اگر موجودہ حالات میں بالکل ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سہیل انجم برسہابرس تک صحافت کے خارزار میں اپنے تلووں کو لہولہان کرتے رہے ہیں۔ وقت کی چلچلاتی دھوپ میں وہ ایک مدت تک کسی شجر سایہ دار یا سائبان کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحمل، یہ قوت برداشت، ہر تلخ بات کو نرم لہجے میں کہہ ڈالنے کی غیر معمولی صلاحیت اور تنقیص کے بجائے صحت مند تنقید کی ڈگر پر چلتے چلے جانے کا جو حوصلہ ان کی کتاب

کے سطور اور بین السطور دونوں میں ہی پوری قوت کے ساتھ جھلکتا ہے، غالباً انہی دنوں کی دین ہے"۔

یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں آئی اور بہت مقبول ہوئی۔ اب تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر یونیورسٹیوں میں صحافت کے موضوع پر پڑھانے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ انھوں نے مجھے ہدایت دی کہ میڈیا کو اپنا موضوع بنا لو اس پر لکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں نے ان کی نصیحت پر عمل کیا اور اس کے بعد میڈیا کے موضوع پر میری کئی کتابیں شائع ہوئیں۔

جب ۲۰۱۰ء میں میری کتاب "میڈیا اردو اور جدید رجحانات" شائع ہونے لگی تو میں نے پھر ان سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ لیکن اس وقت تک ان کی لکھنے کی عادت بہت کم ہو گئی تھی لہٰذا وہ تیار نہیں ہوئے۔ میں نے ایک ترپ کا پتا پھینکتے ہوئے کہا کہ اگر آپ مقدمہ نہیں لکھیں گے تو میں اس کتاب کا انتساب آپ کے نام کر دوں گا۔ انھوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ جب کتاب پریس جانے لگی تو میں نے ایک بار پھر فرمائش کی۔ مگر وہ اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکے۔ میں نے پھر کہا کہ میں کتاب کا انتساب آپ کے نام کر دوں گا۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں زور دیتے ہوئے کہا:

"ارے بھائی اپنے بزرگوں کے نام انتساب کرو نا میرے نام نہیں"۔

میرے منہ سے بے ساختہ اور بلا ارادہ نکل گیا "آپ بھی تو میرے بزرگ ہیں"۔

خاموش ہو گئے کچھ بولے نہیں۔ چند ثانیوں کے بعد انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا:

"جو سمجھ میں آئے کیجیے مگر جو بھی لکھیے گا مجھے دکھا دیجیے گا"۔

میں نے دو جملے انتساب کے لکھے اور انھیں فون پر سنا دیا۔ انھوں نے معمولی سی تبدیلی کر کے پاس کر دیا۔ لیکن مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ وہ کتاب شائع ہو کر پریس سے آنے سے قبل ہی وہ دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکے کہ ان کے ایک معتقد نے جو ان کا شاگرد نہ ہونے کے باوجود خود کو ان کا معنوی شاگرد کہتا ہے عقیدت کے کن موتیوں کو انتساب کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔

۲۰۰۶ء میں ہندوستان میں سعودی سفارت خانے کی جانب سے مجھے فریضہ حج کی ادائیگی کی سعادت نصیب ہوئی۔ پندرہ دن کا سفر تھا۔ واپسی کے بعد ان کا اصرار ہوا کہ حج کا

سفرنامہ لکھ دو۔ میں نے روزنامہ قومی آواز میں چار قسطوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا سفرنامہ لکھ دیا جسے دوسروں کے ساتھ انھوں نے بھی بہت پسند کیا۔ وہ روز مجھے بلاتے اور پڑھوا کر سنتے۔ سفرنامہ مکمل ہونے کے بعد انھوں نے مجھ سے ایک روز کہا: ''کیا یہ سفرنامہ اتنا ہی رہے گا''۔

میں نے کہا: ''نہیں، یہ تو میں نے یہ سوچ کر چھوٹا لکھا تھا کہ پتہ نہیں چراغی صاحب بڑا سفرنامہ چھاپیں گے یا نہیں''۔ حالانکہ بعد میں اندازہ ہوا کہ میں جتنا بھی لکھتا چراغی صاحب سب چھاپ دیتے۔

محفوظ صاحب کہنے لگے: ''اس سے پہلے کہ یہ آگ ٹھنڈی ہو جائے پورا سفرنامہ لکھ ڈالیے''۔

ان کی ہدایت پر میں نے سفرنامہ مکمل کیا اور اس کا نام ''پھر سوئے حرم لے چل'' رکھا۔ میں ایک باب لکھتا اور ان کی ہدایت پر ان کو پڑھ کر سناتا۔ اس کے اجرا کے پروگرام میں لوگوں نے اس کی بڑی پذیرائی کی۔

انتقال سے کئی سال قبل سے ہی انھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے کسی بھی صحافی کو خواہ وہ کسی اخبار کا ایڈیٹر ہی کیوں نہ ہو اور صحافت کی مین اسٹریم ہی میں کیوں نہ بیٹھا ہو ان سے زیادہ باخبر نہیں دیکھا۔ میں نے ان سے اپنے تعلق کے زائد از بیس سال کے عرصے میں کسی عوامی پروگرام میں جاتے ہوئے ان کو نہیں دیکھا۔ ہاں ایک پروگرام میں وہ ضرور گئے تھے۔ وہ پروگرام ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی پر ایک یادگاری مجلّہ کی اشاعت کے بعد اس کے اجرا کا تھا جو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا تھا۔ وہ مجلّہ بھی اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام انہی کی ہدایت پر شائع کیا گیا تھا جو کہ غالباً محفوظ صاحب نے ڈاکٹر فریدی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے شائع کروایا تھا۔ اس میں مولانا علی میاں ندوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سمیت متعدد نامی گرامی شخصیات کے مضامین شامل تھے۔ یہ تمام مضامین محفوظ صاحب کی کاوشوں سے حاصل کیے گئے تھے۔ اس تقریب اجرا میں پہلی صف میں ان کے برابر والی نشست پر میں بیٹھا تھا اور ان سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اشاروں میں فوٹو گرافر سے تصویر لینے کو کہا۔ اس نے جیسے ہی اپنا لینس درست کرنا چاہا انھوں نے اسے ڈانٹ

کر بھگا دیا۔ لیکن بہر حال وہ فوٹو گرافر ہی کیا جو فوٹو لینا چاہے اور نہ لے سکے۔ اس نے ایک تصویر اتار ہی لی۔

ان کے گھر پر جسے ہم لوگ ''خانقاہ'' کہا کرتے تھے ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ مخالفین بھی موافقین بھی۔ ملا بھی اور پنڈت بھی۔ مسلمان بھی اور کافر بھی۔ بت شکن بھی اور بت گر بھی۔ وکیل بھی اور ڈاکٹر بھی۔ صحافی بھی اور پروفیسر بھی۔ تعلیم یافتہ بھی اور ان پڑھ بھی۔ وہ لوگ بھی جن کی سیاست اور جن کی پالیسیوں کے وہ مخالف تھے اور وہ لوگ بھی جو ان کے اپنے قریبی حلقے میں شامل تھے۔ وہ اپنی تحریروں میں جن لوگوں کو ہدف تنقید بناتے وہ بھی آتے اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔ وہ ان سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود ان کو اپنے گھر آنے سے نہیں روکتے اور لوگ بھی آنے سے نہیں مانتے۔ وہ کچھ دنوں تک مسلم مجلس میں بھی رہے اور اس وجہ سے مسلم مجلس سے وابستہ افراد بھی ان کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔

پدم شری پروفیسر اختر الواسع سمیت بہت سے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ اختر الواسع تو کہا کرتے تھے کہ محفوظ بھائی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ صحافی نہیں ''صحابی'' ہیں۔ ان کے انتقال سے چند ماہ قبل انھوں نے کہا کہ سہیل چلو محفوظ بھائی سے ملنا ہے۔ میں نے کہا جس روز آپ کہیں میں ان کو فون کر دیتا ہوں چلے چلتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلاں روز چلیں گے اور ان سے کہیے کہ ان کے یہاں ہم لوگ بعد نماز مغرب پہنچیں گے اور نہاری بھی کھائیں گے۔ پروگرام بن گیا۔ ہم لوگ متعینہ وقت پر پہنچ گئے۔ پہلی بار میں نے دیکھا کہ زینے سے داخل ہونے پر سامنے جو لابی تھی اس میں انھوں نے ڈائننگ ٹیبل لگوائی تھی۔ انھوں نے بہت اچھی نہاری اور بھیجے منگوائے تھے۔ کھانے پر بہت سارے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

محفوظ صاحب سیاست دانوں سے تو تعلق رکھتے تھے مگر سیاست سے نہیں۔ چودھری دیوی لال، چرن سنگھ، پیلو مودی، وی پی سنگھ، راج نرائن اور ایسے بہت سے سیکولر سیاستدانوں سے دوستی کی حد تک ان کے تعلقات تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی کوئی غلط فیصلہ کیا تو وہ ان کے قلم کی دھار سے بچ نہیں سکا۔ وہ سیاست سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے۔ صرف سیاست سے ہی نہیں بلکہ سیاست دانوں کے توسط سے حاصل ہونے والے فیوض و برکات کو بھی دور سے سلام

کرتے تھے۔ مذکورہ سیاست دانوں نے اپنے اپنے سیاسی عروج کے زمانے میں ان کو نوازنے کی بہت کوشش کی لیکن انھوں نے کسی کی بھی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔

ان کے ایک بہت ہی قریبی دوست جلال الدین اسلم نے، جن کو وہ اپنا چھوٹا بھائی کہتے تھے، روایت کی ہے کہ جب وی پی سنگھ وزیر اعظم بن گئے تو انھوں نے ان کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ وی پی سنگھ نے کئی بار اپنے فرستادے بھیج کر ان کو بلوانا چاہا لیکن وہ وعدہ کر کے داؤ دیتے رہے۔ جب وہ وزیر اعظم کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے تو وہ ان سے ملنے گئے۔ ان کو دیکھتے ہی وی پی سنگھ بہت ناراض ہوئے۔ درشت لہجے میں بولے کہ اب کیوں آئے ہو، اب کیا ملے گا، جب میں دینے کی پوزیشن میں تھا اور تم کو بلاتا رہا تو تم آئے ہی نہیں۔ ان کی اس خفگی کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ طاری تھی۔ انھوں نے تڑ سے جواب دیا:

"اب اس لیے آیا ہوں کہ اب ہم دونوں برابر ہو گئے ہیں"۔

وی پی سنگھ نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ کہا "کیا مطلب؟"۔

انھوں نے کہا "نہ میرے پاس نوکری ہے نہ آپ کے پاس"۔

ایک بار وہ وی پی سنگھ کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ سیاسی گفتگو چل رہی تھی۔ وی پی سنگھ نے مسلمانوں کے بارے میں کچھ ایسی بات کہی جو محفوظ صاحب کے خیال میں ٹھیک نہیں تھی۔ انھوں نے احتجاج کیا اور کہا کہ ایسا نہیں ایسا ہے۔ وی پی سنگھ اپنی بات پر اڑے رہے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد انھوں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور اتر کر یہ کہتے ہوئے چلتے بنے کہ جائیے آپ کا راستہ الگ ہے میرا راستہ الگ ہے۔

جلال الدین اسلم نے ہی ایک اور واقعہ بتایا۔ ملک کے سرکردہ لیڈر پیلو مودی زندہ تھے۔ اس وقت کئی سیاسی پارٹیوں کا ایک محاذ قائم ہوا تھا۔ وہ اردو، ہندی اور انگریزی میں "مارچ آف دی نیشن" نامی ایک اخبار نکالتے تھے۔ اسلم صاحب اردو کا پرچہ سیٹ کیا کرتے تھے۔ اس وقت ٹیلی فون کہیں کہیں ہی لگا ہوتا تھا۔ کال دریں بھی مہنگی تھیں۔ جس کمرے میں اسلم صاحب بیٹھتے تھے وہاں ایک فون تھا مگر کوئی ذاتی کام سے فون نہیں کر سکتا تھا۔ جب بل آتا تو کال ڈیٹیل بھی منسلک ہوتی۔ ایک روز انھوں نے لکھنؤ میں محفوظ صاحب کو یہ سوچ کر فون کیا کہ جب بل

آ ئے گا تو وہ ادا کر دیں گے۔ بل آیا اور پیلو مودی نے اسے چیک کیا تو اس میں ایک کال لکھنؤ کی بھی تھی۔ انھوں نے پوچھا کہ لکھنؤ کس نے کال کی ہے؟

اسلم صاحب نے کہا "ہاں میں نے کی ہے کیا بل آ گیا کتنا ہے میں دے دیتا ہوں"۔

پیلو مودی نے انھیں اپنے پاس بلایا اور کہا "کس کو فون کیا تھا"۔

انھوں نے کہا "وہاں میرے بڑے بھائی رہتے ہیں ان کو کیا تھا"۔

انھوں نے پوچھا "کیا کرتے ہیں"۔

اسلم صاحب نے جواب دیا "قائد اخبار کے ایڈیٹر ہیں"۔

"کیا نام ہے"۔

"محفوظ الرحمٰن"۔ انھوں نے جواب دیا۔

"ارے وہ تو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمھارا بڑا بھائی ہے"۔ پیلو مودی نے خوش ہو کر کہا۔

محفوظ صاحب نے تا عمر عسرت میں گزارنا منظور کیا مگر سیاست دانوں کے سامنے کاسہ لیسی گوارہ نہیں تھی۔ نہ ہی انھوں نے کسی سیاست داں سے دوستی کے عوض اس کی قصیدہ خوانی کی یا اس کے کسی غلط فیصلے کی حمایت کی۔ وہ آخر وقت تک اپنے اصولوں پر قائم رہے۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں اصول پسندی، خودداری، غیرت مندی اور دیانت داری کے جو نقوش ثبت کیے ہیں وہ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ جب پوری زندگی خارزار صحافت میں گزارنے اور اپنے تلووں کو لہولہان کرنے کے بعد دہلی اردو اکادمی کی جانب سے ان کو صحافت کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تو ان کے چہرے کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔ اس لیے نہیں کہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا بلکہ اس لیے کہ "اب فلاں فلاں بل ادا ہو جائے گا"۔ ان کو کبھی اس کی پروا نہیں رہی کہ کوئی ان کی خدمات کا اعتراف کرے اور انھیں انعام و ایوارڈ سے نوازے۔ وہ ایوارڈ لینے بھی نہیں گئے۔ البتہ خیر خواہوں اور دوستوں کے کہنے پر انھوں نے اپنے بیٹے کو ایوارڈ لینے بھیج دیا تھا۔

وہ ایک ظریف اور بذلہ سنج انسان تھے۔ موڈ میں ہوتے تو بڑی دلچسپ اور شگفتہ گفتگو کرتے۔ ایک بار ڈاکٹر سید احمد خاں نے ان کے سامنے ایک شخص کی جوان کے یہاں آیا کرتے

تھے تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت بے باک ہیں، بے خوف ہیں، بے لاگ ہیں۔ محفوظ صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ انھوں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ ایک ''ب'' بھول رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چونک کر اور ہنستے ہوئے کہا کہ کون سا؟ انھوں نے کہا کہ بیوقوف بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ہنسی قہقہے میں بدل گئی اور محفل زعفران زار ہوگئی۔

ڈاکٹر سید احمد ہی ایک بار ڈاکٹر شرر مصباحی کو ان سے ملوانے لے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک مجلس رہی۔ جانے کہاں کہاں کی باتیں ہوئیں۔ شرر صاحب کے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

انھوں نے مسکراتے ہوئے اور برجستہ کہا ''ان کے نام میں ایک 'ر' زائد ہے''۔ پھر قہقہہ بلند ہوا۔ مذکورہ دونوں اشخاص سے واقفیت رکھنے والے جس شخص نے بھی یہ جملے سنے اس نے ان کا خوب مزا لیا۔

وہ ایک زیرک صحافی تھے۔ ان کے اندر معاملات کو سمجھنے کی جو صلاحیت تھی وہ کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ جماعت اسلامی کے نظریات کو ناپسند کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی قابلیت و صلاحیت نے ان کو اس کے اخبار ''دعوت'' کا مدیر بنا دیا۔ پہلے وہ محمد مسلم صاحب کی ادارت میں ایڈیٹوریل میں کام کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد انھیں ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ باہر سے آنے والے مضامین یا رپورٹوں کو شائع کرتے وقت وہ اس بات کا خیال رکھتے کہ ان رپورٹوں کی زبان معیاری ہو۔ اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ زبان او راچھی ہوسکتی ہے تو اس مضمون یا رپورٹ کو ایک بار پڑھتے اور پھر پھاڑ کر پھینک دیتے۔ وہ اسی موضوع پر دوسری تحریر لکھ دیتے اور اسے اسی شخص کے نام سے شائع کرتے۔

میں نے ان کے رہن سہن، خورد و نوش، انداز گفتگو میں جو یکسانیت دیکھی وہ بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گزرتی رہی ہے۔ لیکن کبھی بھی کسی مہمان کو یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ وہ کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ ہونٹوں پر وہی روایتی مسکراہٹ، وہی روایتی طرز گفتگو، وہی مہمان نوازی اور وہی خوش اخلاقی جو فراخ دستی میں ہوتی وہی تنگ دستی میں بھی ہوتی۔ انھوں نے اور ان کے بچوں نے کم سے کم بجٹ میں سلیقہ شعاری کے

ساتھ جینے کا جو ہنر سیکھا وہ آسانی سے نہیں سیکھا جا سکتا۔ زمانے کے حوادث اور وقت کے سرد وگرم یہ ہنر سکھاتے ہیں لیکن وہی سیکھ سکتا ہے جو سیکھنا چاہتا ہو اور جس کے اندر سیکھنے کی صلاحیت ہو۔

محفوظ الرحمٰن کی شخصیت میں ایک بانکپن تھا، ایک عجیب بانکپن۔ جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنی شان کج کلاہی کو کبھی ماند نہیں پڑنے دیتے تھے۔ اس پر انھیں بہت فخر بھی تھا۔ تا عمر وہ اس شان کو برقرار رکھنے کے لیے جدو جہد کرتے رہے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ عمر کے آخری ایام میں انھیں شوگر اور بلڈ پریشر کی شکایت ہو گئی تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ ان کی آمد و رفت کا بند ہو جانا بھی تھا۔ مگر کسی اسپتال میں جا کر نہ کبھی چیک اپ کراتے اور نہ ہی کسی بڑے ڈاکٹر سے مشورہ کرتے۔ ان کے حلقے میں کچھ مخصوص ڈاکٹر تھے جو گھر پر آکر ان کا علاج کیا کرتے۔ ان کے بیٹے ہی ان کی شوگر اور بلڈ پریشر چیک کرتے۔ وقت پر دوائیں کھلانے کی ذمہ داری بھی انہی کی تھی۔

آخری دنوں میں وہ روزنامہ راشٹریہ سہارا میں ہفتہ واری کالم لکھنے لگے تھے۔ بہت پابندی کے ساتھ کالم لکھتے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے ملنے والے معاوضے سے کچھ ضرورتیں پوری ہو جاتیں۔ اس کالم کے ذریعے بہت سے ایسے لوگوں نے جو ان کی صحافت سے واقف نہیں تھے سنجیدہ صحافت کا نمونہ دیکھا۔ ان کے مضامین یوں تو بیشتر سیاسی ہوتے لیکن ملی معاملہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ پانچ فروری ۲۰۱۰ بروز جمعہ شائع ہونے والے ان کے مضمون کا عنوان تھا ''امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کی منفی شبیہ''۔ یہ مضمون ان کی زندگی کا آخری مضمون ثابت ہوا۔ ذرا غور کیجیے کہ ان کے قلم سے پھوٹنے والی آخری تحریر میں بھی مسلمانوں کے محاذ پر کھڑے ہو کر بڑی جی داری کے ساتھ مخالفین اسلام پر قلم کے ذریعے گولہ باری کی گئی تھی۔

اگلے روز یعنی ہفتہ کی صبح پانچ بجے انھیں بے چینی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بچے جاگ گئے۔ بیٹے نے دوا دی۔ گھر والوں نے کہا کہ کچھ کھا لیجیے ممکن ہے کہ بھوک کی وجہ سے یہ کیفیت ہو گئی ہو۔ انھوں نے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ جاؤ آپ لوگ آرام کرو، میں بھی آرام کرتا ہوں۔ ابھی سات بجے تو سب لوگ ناشتہ کریں گے ہی۔ اس وقت ہم بھی ساتھ میں کرلیں گے۔ بچے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے۔ وہ اپنے بیڈ پر سو گئے۔ سب لوگ چھ بجے اٹھ گئے مگر

محفوظ صاحب کے کمرے میں دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ نہ انھوں نے کسی کو آواز دی اور نہ ہی وہ ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے اٹھے۔ بچے جب ان کو جگانے گئے تو دیکھا کہ بیڈ پر خالی جسم پڑا ہوا ہے، روح جانے کب کی پرواز کر گئی ہے۔ اس طرح اردو صحافت کا ایک عظیم باب لمحے بھر میں بند ہو گیا۔ وہ شخص جو زندگی بھر اپنے قلم کے ذریعے خوابیدہ ملت کو جگاتا رہا آغوش مرگ میں سو گیا۔ لیکن اپنی شان کج کلاہی کو ماند نہیں پڑنے دیا۔

صبح کو تقریباً نو بجے کسی کام سے میں نے ڈاکٹر سید صاحب کو فون کیا تو انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا کہ محفوظ الرحمٰن صاحب نہیں رہے۔ سنتے ہی یوں لگا جیسے مکان کی چھت بھک سے اڑ گئی ہو۔ ان کے گھر پہنچا۔ ان کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ ان کی مجلس کے ایک رفیق اور ان کے شاگرد مولانا عقیدت اللہ قاسمی نے کہا کہ آپ محفوظ صاحب کا چہرہ نہیں دیکھیں گے۔ انھوں نے چادر ہٹائی۔ میں نے ان کے چہرے کا آخری بار دیدار کیا۔ یادوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی بھی کھڑکیاں کھل گئیں اور عقیدتوں کی شبنم برسنے لگی۔

☆☆

موہن چراغی

(صحافت کا چراغ)

موہن چراغی تین مارچ ۱۹۳۹ء کو جموں وکشمیر کے سری نگر میں ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال یکم فروری ۲۰۱۰ء کو کلکتہ میں ہوا۔ ان کے والد اپنے اصولوں کے پکے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی انھیں کی طرح بااصول بنے۔ اس کے لیے وہ ان پر سختیاں بھی کرتے اور بقول موہن چراغی یہ سختیاں بعض اوقات جسمانی سزا میں بھی تبدیل ہو جاتیں۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ایک بڑا آدمی بنے یا نہ بنے لیکن بڑا انسان ضرور بنے۔ اسی لیے وہ اپنے اصولوں کے سانچے میں موہن چراغی کو ڈھالنے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ اصول پسندی ان کو پسند نہیں تھی اور والد کی سختیاں ان کو گراں گزرتیں۔ جس کا نتیجہ اس شکل میں نکلا کہ موہن چراغی کے بقول ''مزاج پر آوارہ پن حاوی ہو گیا''۔ اس آوارہ پن نے انھیں دردر بھٹکایا۔ انھوں نے کبھی کوئی نظریہ اختیار کیا تو کبھی کوئی۔ کبھی کوئی کام کیا تو کبھی کوئی۔ انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ کہیں ان کے مزاج کا 'آوارہ پن' خاندان کی عزت کی لٹیا نہ ڈبو دے۔

موہن چراغی نے ۱۹۹۶ء میں جموں وکشمیر کی سیاست پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے ''برف میں آگ''۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے ''میں ایک سیدھا سادہ کشمیری، جو ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں سونے کا چمچہ لیے پیدا ہوا۔ بچپن آرام سے کٹا لیکن خاندان کی لمبی ناک کو اور لمبا کرنے کی خواہش میں والد نے ایسے ڈسپلن میں جکڑ دیا

کہ مزاج پر آوارہ پن حاوی ہوگیا۔ نا چاہتے ہوئے بھی ناستک (دہریہ) بن گیا اور یہیں سے شروع ہوئی میری بغاوت۔ آہنی ڈسپلن، خاندانی روایت، مذہبی رسومات اور فرسودہ خیالات کے خلاف''۔

اس بغاوت نے ان کے مزاج میں بڑے پیمانے پر تبدیلی پیدا کر دی۔ انھیں سرمایہ داری سے نفرت ہوگئی۔ سماج میں غیر مساوات اور نابرابری نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ کسی ایسے راستے پر چلنے کے لیے بیتاب تھے جہاں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہو اور جہاں نابرابری کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس تعلق سے جب انھوں نے غور کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ کمیونزم ہی ایک ایسا نظریہ ہے جو سماج سے نابرابری ختم کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کمیونسٹ ہو گئے۔ وہ اس بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جوانی پر نکھار آیا یا نہیں یاد نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور یاد ہے کہ جوانی میں قدم رکھا تو غربت، بھوک، بیماری منہ کھولے نگلنے کو تیار تھی۔ مایوسی اور یاسیت کے گھیرے میں قید کئی بار فرار کا راستہ اختیار کیا لیکن ہر بار پکڑا گیا۔ سیاسی اور ادبی محفلوں میں ذہنی عیاشی کا ایسا روگ لگ گیا کہ کمیونسٹ بن گیا۔ پرولتار کے لیے سڑکوں پر اخبار فروحت کرتا رہا۔ ڈی کلاس ہونے کے لیے گندی نالیوں پر خارش زدہ چھابڑی فروشوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتا رہا۔ غریبوں کے غم میں کئی کئی روز کپڑے نہ بدلنا، ناخن لمبے، گندے بال۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گھر گھر جا کر بڑے لوگوں کے صاحبزادوں کو پڑھانا۔ اپنی آوارگی میں مست۔ مستی کا خمار اترا تو لوگ کافی آگے نکل چکے تھے...... برسوں کے بعد گھر پر نظر پڑی تو آدھا مکان بک چکا تھا۔ اجنبی لوگ مکان کے گوشوں پر قابض ہو گئے تھے..... گھر کا ایک حصہ خالی، بالکل ننگ۔ برتن، فرنیچر اور دیگر سامان سب کچھ بک چکا تھا۔ ایک اندھرے کونے میں ننگے فرش پر پڑی تھی بیوہ والدہ''۔

ان واقعات نے موہن چراغی کی زندگی پر منفی اثر ڈالا جس کی جھلک ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی بھر دہشت گردی اور ظلم و زیادتی کے خلاف لکھتے رہے۔ جموں و کشمیر میں جب دہشت گردی کو عروج حاصل ہوا تو چراغی بھی اس کی زد میں آ گئے اور ان کا تین منزلہ مکان خاکستر ہو گیا، لائبریری جلا دی گئی اور انھوں نے بھی دوسرے کشمیری پنڈتوں کی مانند اپنے

آبائی وطن کو خیر باد کہہ دیا اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔

اخبار میں کام کرنے سے قبل انھوں نے سری نگر میں کمیونسٹ پارٹی کی کتابوں کی دکان پر ملازمت کی اور کتابیں بیچنے لگے۔ لیکن یہ نوکری زیادہ دن برقرار نہیں رہ سکی۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ کچھ کمیونسٹوں نے جو حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی کمیونسٹ تھے، دکان پر قبضہ کر لیا اور اس میں شراب خانہ کھول دیا۔ جن الماریوں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، غالب اور سرلا دیوی کی کتابیں سجا کرتی تھیں ان میں شراب کی بوتلیں سجائی جانے لگیں۔ اس صورت حال نے موہن چراغی کو بری طرح متاثر کیا۔ انھوں نے کانگریس پارٹی میں بھی کام کیا اور متعدد بڑے لیڈروں کو قریب سے دیکھنے کا انھیں موقع ملا۔ اسی دوران انھوں نے نئی دہلی سے شائع ہونے والے کانگریس کے انگریزی اخبار روزنامہ ''نیشنل ہیرالڈ'' کے لیے سری نگر سے رپورٹنگ شروع کر دی اور پھر انھیں وہاں نیشنل ہیرالڈ کا نمائندہ مقرر کر دیا گیا۔

۱۹۸۰ء میں جب اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے دہلی سے اردو روزنامہ قومی آواز کا اجرا کیا تو چونکہ وہ اردو جانتے تھے اور انھیں اردو اخبار میں کام کرنے کا بہت اشتیاق تھا اس لیے وہ نئی دہلی آگئے۔ پھر کمپنی کے چیئرمین یشپال کپور نے انھیں روزنامہ قومی آواز کی ایڈیٹوریل ٹیم میں شامل کر دیا۔ انھوں نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۷ء تک قومی آواز میں بطور رپورٹر کام کیا۔ اس وقت عشرت علی صدیقی ایڈیٹر تھے۔ اسی دوران انھوں نے موہن چراغی کو قومی آواز دہلی کا اور عثمان غنی کو لکھنؤ ایڈیشن کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد اخبار میں ہڑتال ہوگئی اور دہلی سے روزنامہ انقلاب جاری ہوا تو قومی آواز کی تقریباً پوری ٹیم وہاں چلی گئی۔ اس کی ایڈیٹر نور جہاں ثروت تھیں۔ جو اس سے قبل قومی آواز کے ہفت روزہ ایڈیشن کی ادارتی انچارج تھیں۔

چودہ ماہ کی ہڑتال کے بعد جب قومی آواز دوبارہ شروع ہوا تو اس کی تقریباً پوری ٹیم اس میں واپس آگئی البتہ نور جہاں ثروت واپس نہیں آئیں۔ وہ تادم آخر انقلاب کی دہلی میں ریذیڈنٹ ایڈیٹر رہیں۔ اس دوران چراغی صاحب سری نگر چلے گئے تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ اخبار پھر نکل رہا ہے اور نور جہاں ثروت کو بحیثیت ایڈیٹر واپس لانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو

وہ دہلی چلے آئے۔ نور جہاں ثروت کے واپس نہ آنے کی وجہ سے انھیں قومی آواز کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ دو تین سال کے بعد وہ ریٹائر ہو گئے مگر کمپنی نے انھیں بحال رکھا اور گریڈ کے بغیر ایک مقررہ تنخواہ پر انھیں کام کرنے کو کہا۔ اس وقت سے لے کر ۳۰ مارچ ۲۰۰۸ء کو اخبار کے بند ہونے تک وہ ایڈیٹر رہے۔

موہن چراغی کشمیر کے باشندہ تھے اور کشمیر میں اردو اخبارات پہلے بھی بڑی تعداد میں نکلتے رہے ہیں اور اب بھی نکلتے ہیں۔ انھیں ان اخباروں کو دیکھ کر لالچ ہوتا کہ کاش وہ بھی کسی اردو اخبار میں کام کرتے۔ بالآخر قومی آواز نے انھیں ایک پلیٹ فارم دے دیا۔ نہ صرف پلیٹ فارم دیا بلکہ ایک شناخت بھی عطا کی۔

پہلے لکھنؤ اور پھر دہلی سے قومی آواز کی کامیاب اشاعت کے بعد دوسرے شہروں سے بھی اس کے ایڈیشن نکلے۔ جن میں سری نگر ایڈیشن بھی شامل ہے۔ بہت سے لوگ سری نگر سے اخبار نکالنے کے خلاف تھے۔ لیکن موہن چراغی اس کے زبردست حامی تھے کہ سری نگر سے بھی قومی آواز کا ایڈیشن نکلنا چاہیے اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے دوست، رفیق کار اور قومی آواز کے ہیڈ کاتب اور خطاط جناب جلال الدین اسلم کے ساتھ مل کر سری نگر ایڈیشن کے خدوخال طے کیے اور پھر وہاں سے اخبار نکل آیا۔ جلال الدین اسلم نے سب ایڈیٹروں اور کاتبوں کی تقرری میں اہم رول ادا کیا۔ اس کی ذمہ داری انھیں پر تھی۔ وہ ایک ماہ تک وہاں رہے۔ جب اس کا ڈھانچہ تیار ہو گیا اور اخبار نکلنے لگا تو واپس آ گئے۔

سری نگر میں بقول چراغی صاحب پیسے کے بغیر نہ تو خبر چھپتی تھی اور نہ ہی مراسلہ۔ انھوں نے اس روایت کو توڑنے کی کوشش کی اور اعلان کر دیا کہ قومی آواز میں بغیر پیسے کے خبروں اور مراسلات کی اشاعت ہوگی۔ لیکن یہ اعلان کسی کے گلے نہیں اتر رہا تھا اور لوگ حیرت زدہ تھے کہ یہ کیسا اخبار ہے جس کو پیسے کی ضرورت نہیں یا جو پیسے کے بغیر ہی خبریں اور مراسلات چھاپتا ہے۔

موہن چراغی نے اپنی کتاب ''برف میں آگ'' میں اس معاملے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں'' ۱۹۸۹ء میں قومی آواز کا سری نگر ایڈیشن خدمت بلڈنگ سے شروع کیا گیا۔ قومی آواز کا سری نگر ایڈیشن شروع کرنے میں کئی طرح کی رکاوٹیں ڈالی گئیں...... ریاست کی صحافتی زندگی

میں قومی آواز کا آجانا ایک صحت مند تبدیلی تھی.....قومی آواز نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اعلان کیا کہ مراسلوں، عوامی شکایات اور خبروں کو بغیر اجرت کے شائع کیا جائے گا۔ اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ کئی روز تک قومی آواز کے دفتر کی طرف کسی نے رخ نہیں کیا۔ کیونکہ ہر ایک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ جو اخبار بغیر اجرت کے خبریں شائع کرنے کا وعدہ کرتا ہے اس میں خبریں شائع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب یہ بات عام ہو گئی تو قومی آواز کی اشاعت پانچ سو کاپیوں سے بڑھ کر دس ہزار یومیہ ہو گئی"۔

یوں تو چراغی صاحب پیسوں کے معاملے میں بہت سخت تھے اور دہلی میں بھی وہ ایسے لوگوں کو دفتر میں آنے نہیں دیتے جو لالچ دکھا کر خبریں چھپوانے کی کوشش کرتے۔ لیکن ان کو قریب سے جاننے والے ہمیشہ اس شبہے میں مبتلا رہے کہ اس معاملے میں چراغی صاحب کا رویہ وہ نہیں ہے جس کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس ہے۔

انھوں نے زندگی بھر ایک اردو اخبار میں کام کیا لیکن زندگی بھر وہ اردو صحافت سے شاکی رہے۔ بعض اوقات اردو صحافت اور اردو زبان سے متعلق ان کی گفتگو سے ایسا لگتا جیسے وہ اردو دشمن ہیں۔ بہت سے لوگ ان کو یہی مانتے رہے۔ وہ اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ موہن چراغی اردو کے آدمی ہیں یا اردو کے معاملے میں سنجیدہ ہیں۔ حالانکہ چراغی صاحب اس کا دعویٰ کرتے رہے کہ اردو سے انھیں پیار ہے۔ انھوں نے ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی میری کتاب "میڈیا روپ اور بہروپ" میں لکھے گئے اپنے مضمون میں تحریر کیا تھا:

"میں جب انگریزی زبان کی صحافت سے بھٹک کر اردو صحافت میں ۲۵ برس پہلے آیا تھا تو میرے ذہن میں اردو صحافت کے بارے میں ایک خاص خاکہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان سے میں ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ حالانکہ میرے پاس اردو زبان کی کوئی ڈگری نہیں ہے نہ میں شاعر ہوں اور نہ ہی ادیب، البتہ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے اندر کے جذبات کو اردو زبان کے ذریعہ باہر لا سکتا ہوں۔ میں جب اردو صحافت کی جنت سے باہر تھا تو ہر وقت مجھے یہ خواہش ستاتی رہتی تھی کہ اس جنت میں کیسے داخلہ ملے گا اور جب اس جنت میں داخل ہونے کا موقع ملا تو مجھے مرحوم لیش پال کپور جیسے نڈر اور باصلاحیت سرپرست اور عشرت علی صدیقی جیسے عظیم اردو صحافی کی

سرپرستی حاصل ہوئی۔ یہ وہ یگ تھا جب قومی آواز کا طوطی بولتا تھا اور اس میں کام کرنے والے سبھی ساتھی میری طرح بے چہرہ اور بے نام تھے۔ لیکن قومی آواز ہماری پہچان بن گیا۔ اور ہم بے نام ہو کر بھی نیک نام بن گئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب تاجر پیشہ اور کاروباری ذہنیت کے لوگوں نے اردو صحافت کی طرف رُخ کیا اور سیاستدانوں نے اردو صحافت کو اپنے ووٹ بینک کا بیئرر چیک بنا دیا تو اردو صحافت جو کہ پہلے ہی Developed صحافت نہیں تھی عرش سے فرش پر آ گئی اور مجھ جیسا اردو صحافی بھی محسوس کرنے لگا کہ اس جنت میں داخل ہونے کی خواہش خودکشی تھی۔ ۲۵ برسوں کے تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ اردو صحافت ابھی تک اپنے وجود کو منوا نہیں سکی ہے اور نہ ہی تنگ و تاریک حلقوں سے آزاد ہو کر مثبت رول ہی ادا کر پا رہی ہے"۔

وہ مزید لکھتے ہیں: ''اردو صحافت کا المیہ یہ ہے کہ خود اردو والوں اور سیکولر سیاست کا اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے بے سُرا ہارمونیم بجانے والوں نے اردو زبان کو قومی دھارے سے دور رکھا۔ اردو زبان کو مسلمان بنایا گیا اور اس طرح اردو صحافت سماج کے ایک حلقہ کی ترجمان بن گئی۔ اگر اس بے معنی اور بے مقصد دلیل کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردو اقلیت کی زبان ہے تو اردو صحافت بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کے حقیقی مسائل اور مشکلات کا احاطہ کرنے اور ان کی رہبری کرنے میں مکمل طور سے ناکام رہی ہے۔ اردو صحافت نے ہمیشہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے اور احساس کمتری میں مبتلا رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو صحافت نے مسلمانوں کی خوداعتمادی کو توڑ کر انھیں اپنے وجود سے مایوس کیا ہے۔ اردو صحافت کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اردو کو ووٹ بینک سیاست نے ترقی کے زینے طے کرنے کا ایک اہم میڈیم بنا دیا ہے۔ اردو صحافت میں ایک ایسا مفاد خصوصی رکھنے والا گروپ حاوی ہے جو اپنے نجی مفادات کے لیے اردو میڈیا کو ووٹ بینک سیاست سے جوڑے رکھنے پر بضد ہے"۔

موہن چراغی نے قومی آواز میں آنے کے بعد پھر انگریزی صحافت کی جانب مڑ کر نہیں دیکھا۔ شائد اب وہاں ان کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ قومی آواز اس وقت مقبولیت کے عروج پر تھا اور اس سے وابستہ تمام لوگوں کو جو عزت اور مقام و مرتبہ حاصل تھا وہ کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔ اگر چراغی صاحب انگریزی صحافت میں واپس جاتے تو ممکن ہے کہ وہ مالی اعتبار سے زیادہ مستحکم

ہو جاتے لیکن شہرت و مقبولیت ان کے مقدر میں نہ آتی۔

موہن چراغی کو بہت سے قارئین اور کئی سرکردہ مسلمان بھی ہندو نہیں بلکہ مسلمان سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار کسی شخص نے موہن چراغی سے کہا کہ انھوں نے حج کے لیے درخواست دی ہے اگر وہ سفارش کر دیں تو درخواست منظور ہو جائے گی۔ انھوں نے متعلقہ شخص سے سفارش کی اور درخواست منظور ہو گئی۔ مگر ''مولانا موہن چراغی'' کے نام سے منظور ہوئی۔ مذکورہ ذمہ دار نے سمجھا کہ یہ مسلمان ہیں، مولانا ہیں اور اپنے لیے سفارش کر رہے ہیں۔ لہٰذا بغیر درخواست کے ہی ان کی حج درخواست منظور ہو گئی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ چراغی صاحب نے بتایا تھا کہ کسی جگہ مسلمانوں کے ایک گروپ میں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی مذہبی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ جب کوئی حل نکلتا نظر نہیں آیا تو ایک شخص نے جو کہ شریک بحث تھا چراغی صاحب سے کہا کہ اچھا جناب آپ بھی مسلمان ہیں، اللہ والے ہیں، آپ بتائیے اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

بہر حال موہن چراغی کو قومی آواز کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ وہ ایک اچھے صحافی تھے۔ البتہ چونکہ کشمیر سے لٹ پٹ کر آئے تھے اس لیے ان کی تحریروں میں ایک خلش تھی، ایک چبھن تھی اور وہ جتنی شدت سے ہندو اکثریت کے تعصب کی مذمت کرتے اسی بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے مسلم اقلیت کے تعصب کی بھی مذمت کرتے۔ وہ مسلمانوں کی جذباتیت کی شکایت اکثر و بیشتر کرتے رہتے لیکن خود ان کی تحریریں بڑی جذباتی ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشرت علی صدیقی کے زمانے میں ایک بار ان کی تحریروں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

وہ ایک ایسے ایڈیٹر تھے جو سب ایڈیٹروں سے بھی زیادہ کام کرتے تھے۔ خاص مواقع پر وہ صفحہ اول پر ایک باٹم اسٹوری لکھتے اور جب وہ اسٹوری ان کے نام چھپتی تو وہ اس کی سرخی کسی مصرعہ سے اور خاص طور پر فیض احمد فیض کے مصرعہ سے لگاتے۔ لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ وہ شاعروں سے بری طرح خار کھاتے تھے۔ لیکن قومی آواز میں کام کرنے والے ایک بہت اچھے شاعر فرحت احساس سے ان کی دوستی تھی۔ دفتر میں اگر کوئی شخص غزل یا نظم لے کر آتا تو اسے ڈانٹ کر بھگا دیتے اور کہتے کہ یہ اخبار شاعری چھاپنے کے لیے نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ عشرت

علی صدیقی کا ایک واقعہ اکثر سناتے کہ ایک بار ایک شیروانی پوش نوجوان دفتر میں آیا اور اس نے کہا کہ جناب میں اخبار میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ عشرت صاحب نے پوچھا کہ آپ ترجمہ وغیرہ کر لیں گے؟ انھوں نے، جن کا منہ پان سے بھرا ہوا تھا، کہا کہ اماں، ہم تو شاعر ہیں شاعری کرتے ہیں۔ اس پر عشرت صاحب نے کہا کہ جناب یہاں آپ کا کوئی کام نہیں ہے کیونکہ ہمیں شاعر نہیں مترجم چاہیے۔

موہن چراغی اظہار خیال کی آزادی کے طرفدار تھے لیکن مسئلہ کشمیر پر اتنے سخت گیر واقع ہوئے تھے کہ اپنے موقف اور نظریے کے خلاف ایک لفظ بھی سننا یا چھاپنا گوارہ نہیں کرتے۔ ان کے قلم میں اتنی شدت تھی کہ بہت سے لوگ ان کو مسلم دشمن سمجھتے۔

جب دو فروری ۲۰۱۰ء کو یہ خبر ملی کہ موہن چراغی کا انتقال ہو گیا تو ایک دھچکہ سا لگا۔ حالانکہ ان کی گرتی ہوئی صحت اور ہفتے میں تین بار ڈائلیسس کے پیش نظر یہ اندیشہ تو تھا کہ اب ان کی عمر کے دن زیادہ نہیں بچے ہیں۔ لیکن یہ گمان نہیں تھا کہ وہ ابھی چلے جائیں گے۔ انتقال سے تقریباً پندرہ روز قبل میرے پاس ان کا فون آیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ کلکتہ جا رہے ہیں جہاں کسی ڈاکٹر سے اپنے مرض کے بارے میں سکنڈ اوپینئن لیں گے۔ انھوں نے مجھے ایک ذمہ داری سونپی اور کہا کہ وہ واپس آ کر اس سلسلے میں مزید بات کریں گے۔ حالانکہ ان کے لہجے کی غیر یقینی یہ چغلی کھا رہی تھی کہ انھیں خود پتہ نہیں ہے کہ وہ واپس آسکیں گے یا نہیں۔ تاہم انھوں نے واپسی پر ملاقات کی بات کہہ کر اپنی خود اعتمادی کے اظہار کی کوشش کی۔

قومی آواز بند ہونے کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ جنوبی دہلی کے سریتا وہار میں اپنی بڑی بیٹی کے فلیٹ میں رہتے تھے جہاں ہم چند لوگوں کے علاوہ شاید اور کوئی ملنے جلنے والا نہیں تھا۔ وہ چونکہ بہت کم آمیز تھے اس لئے سریتا وہار میں دوست احباب بھی نہیں بن سکے تھے۔ قومی آواز کے دنوں میں ان کا زیادہ تر وقت دفتر ہی میں گزرتا تھا اور صبح کو جلد آجانا اور شام کو دیر سے جانا ان کا معمول تھا۔ اس پر ہم لوگ کہتے تھے کہ قومی آواز ان کی زندگی بلکہ ان کی سانس ہے۔ جس دن یہ سانس ٹوٹی وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ تاہم وہ بہت سخت جان نکلے اور قومی آواز کے مرحوم ہو جانے کے بعد بھی تقریباً دو سال تک زندہ رہے۔ ان کو اس کا بڑا ملال تھا کہ اخبار بند

ہونے کے بعد وہ تمام لوگ منظر سے غائب ہو گئے جن کو وہ اپنے دست و بازو سمجھتے تھے۔ اخبار بند ہونے کے بعد جن لوگوں نے ان سے جلد ملاقات کی ان کو تو انھوں نے کچھ نہیں کہا لیکن جنھوں نے بہت دیر سے ان کو یاد کیا انھیں بالکل اسی انداز میں ڈانٹ سننی پڑی جیسی کہ دفتر میں کسی غلطی پر سننی پڑتی تھی۔ جب ڈانٹ کر تھک جاتے تھے تو پھر اسی اپنائیت سے بات کرنے لگتے تھے جو کہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ کہتے بھی تھے کہ یہ تو غصے کا جھاگ تھا جو بلبلے کی مانند اٹھا اور پھوٹ کر ختم ہو گیا۔

موہن چراغی کے مزاج میں صحافیانہ خو بوکوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ جو قومی آواز اور موہن چراغی کے معاملات سے واقف نہیں وہ قومی آواز کے بند ہونے کا الزام ان کے سر ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چراغی نے قومی آواز کو ڈبو دیا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ موہن چراغی شروع کے دنوں میں ضرور نیشنل ہیرالڈ میں ایک طاقتور کردار کے مالک تھے لیکن رفتہ رفتہ حالات اتنے بدتر ہوتے گئے کہ ان پر کسی کا کوئی کنٹرول ہی نہیں رہا۔ نہ چراغی صاحب کا، نہ کارکنوں کا، نہ مینجمنٹ کا اور نہ ہی کمپنی کے چیئر مین کا۔ سب وقت اور حالات کے دھارے پر بہے جا رہے تھے۔ اس دھارے کا رخ موڑنے کی کسی میں سکت تھی اور نہ ہی خواہش۔ موہن چراغی بھی دوسرے کارکنوں کی مانند اس دھارے میں ایک تنکے کی حیثیت رکھتے تھے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہاں کانگریس پارٹی کے ہاتھ میں ضرور طاقت تھی اور وہ بھی اتنی کہ وہ کارکنوں کو معقول معاوضہ دے کر کمپنی بند کر دے۔ سو اس نے وہی کیا۔

اپنے آخری دنوں میں قومی آواز بھی انتہائی غیر معیاری اور خراب اخبار بن کر رہ گیا تھا اور نیشنل ہیرالڈ بھی۔ ہیرالڈ تو بہت پہلے سے ہی غیر معیاری ہونے کا طعنہ جھیل رہا تھا اور اسے سفید ہاتھی کہا جاتا تھا۔ بعد میں قومی آواز بھی سفید ہاتھی ہو گیا۔ موہن چراغی بھی اگر چاہتے تو وہ قومی آواز کو نئی زندگی نہیں دے سکتے تھے اور کوئی دوسرا ایڈیٹر آتا تو وہ بھی اسے نیا جنم دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ البتہ اگر مینجمنٹ میں قوت ارادی ہوتی تو یہ کارنامہ کوئی معمولی سا سب ایڈیٹر بھی سرانجام دے دیتا۔ اس لئے یہ کہنا کہ موہن چراغی نے قومی آواز کو ڈبو دیا ان کے ساتھ ناانصافی ہے اور حالات و معاملات سے یکسر ناواقفیت کی دلیل بھی ہے۔

ن کے انتقال سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل ایک نوجوان اردو صحافی نے، جو کہ صحافت کے موضوع پر ریسرچ کر رہے تھے مجھ سے کہا کہ میں ان کو صحافت کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ میں نے مشورہ دیا کہ موہن چراغی صاحب سے ملو۔ اس پر انھوں نے برجستہ کہا کہ وہ کیا بتائیں گے، انھوں نے تو قومی آواز کو برباد کر دیا۔ میں نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ آپ ان سے ملیے اور فی الحال اس میں نہ پڑیے کہ قومی آواز کو کس نے برباد کیا۔ بہر حال وہ جب مل کر آئے تو ان کی رائے بدل چکی تھی اور دو گھنٹے کی ملاقات میں ان کو اتنا کچھ حاصل ہو گیا کہ ان کا ایک باب مکمل ہو گیا۔ اس لیے جب کوئی کہتا ہے کہ چراغی صاحب نے قومی آواز کو برباد کیا ہے تو مجھ سمیت کئی لوگ ہیں جو اس پر احتجاج کرتے ہیں

ہاں! میں انھیں اس حد تک ضرور قصوروار سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی پوری ملازمت کے دوران کسی ایک بھی کارکن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جبکہ وہ کر سکتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اتنی طاقت تھی کہ ان کے دو لائن لکھنے سے کسی کی بھی ملازمت کے لالے پڑ جاتے۔ لیکن انھوں نے بعض کارکنوں کی گالیاں کھائیں، ان کے ہاتھوں رسوا ہوئے لیکن کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی، جس کے نتیجے میں کئی کارکنوں میں ضابطہ شکنی اور دفتری نافرمانی کا مزاج پیدا ہو گیا۔ دراصل وہ اس کے حق میں نہیں تھے کہ ملازموں کو پورے چھ یا آٹھ گھنٹے تک باندھ کر رکھا جائے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ اخبار پورا ہونا چاہیے خواہ کوئی پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی کر رہا ہو یا تین گھنٹے کی۔ اس سے دفتری نظم و ضبط بری طرح متاثر ہوا جو آخر تک نہیں سنبھلا۔ البتہ جب دفتر میں آمد و رفت کے دستخط ضروری ہو گئے تب جا کر ضابطے کی تھوڑی بہت پابندی ہوئی۔

موہن چراغی میں صحافیانہ خوبیاں بھی تھیں اور انسانی خوبیاں بھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کام سے جی نہیں چراتے تھے۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ آخری عمر میں بھی وہ کسی بھی سب ایڈیٹر یا شفٹ انچارج سے زیادہ کام کرتے تھے۔ اوریجنل رائٹنگ کے علاوہ ترجمہ بھی بہت کرتے تھے اور ہم لوگوں کو بار بار تلقین کیا کرتے تھے کہ ترجمہ کرنا مت چھوڑو ورنہ عادت بگڑ جائے گی اور پھر کر نہیں پاؤ گے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ڈیسک کے تمام لوگ باہر نکل جاتے تھے چائے پینے یا دل بہلانے اور وہ اپنی میز پر ڈٹے رہتے تھے۔ کوئی باہر کا آدمی آجاتا تو اسے بڑی

حیرت ہوتی کہ یہ کیسا ایڈیٹر ہے کہ اکیلے ہی بیٹھ کر کام کیے جارہا ہے۔

ملکی یا بین الاقوامی سطح پر جب بھی غیر معمولی حالات ہوتے تو ان کے اندر بھی غیر معمولی سرگرمیاں شروع ہو جاتیں اور ایسے مواقع پر وہ ایک ایک بات کا خیال رکھتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ خبر میں کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ آخری دنوں میں اگرچہ ان کی دلچسپی کم ہو گئی تھی تاہم وہ سب ایڈیٹروں اور رپورٹروں سے زیادہ کام کرتے تھے۔ اچھے دنوں میں تو یوں بھی ہوتا کہ وہ سات بجے شام کو گھر گئے ہیں اور کوئی اہم خبر آ گئی تو یا تو خود دفتر آ جاتے اور لیٹ نائٹ تک کام کرتے یا پھر گھر سے میٹر تیار کر کے یا تو فیکس کر دیتے یا چپراسی بلا کر اس کے ہاتھ بھجوا دیتے۔ ڈیسک پر ہمیشہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے اور مجھے اس اعتراف میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ البتہ ان کی صحافت بعض اوقات یک رخی ہو جاتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کشمیر کے بارے میں اور پاکستان کے خلاف زیادہ سے زیادہ چیزیں دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان کی انسانی خوبیوں کا مشاہدہ میں نے قومی آواز میں کیا۔ جس دن تنخواہ ملتی تھی وہ ایک ایک کے بارے میں معلوم کرتے اور اگر یہ پتہ چل جاتا کہ فلاں شخص نہیں آیا ہے تو اس کی تنخواہ منگوا کر اس کے علاقے کے کسی شخص سے بھجوا دیتے اور یہ کہتے کہ اس کو ضرورت ہوگی۔ میں نے خود دو ایک بار لوگوں کی تنخواہیں، چراغی صاحب کے کہنے پر، ان کے گھر پہنچائی تھیں۔ عموماً تنخواہ کے روز ڈیسک پر ان کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ وہ کام کر رہے ہوتے اور لوگ اپنی تنخواہیں سنبھالنے میں لگے رہتے۔ جوں ہی کوئی کارکن دفتر میں گھستا خواہ وہ تاخیر سے ہی کیوں نہ آرہا ہو اس سے فوراً کہتے ارے جاؤ پہلے تنخواہ لے لو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کئی لوگ بوقت ضرورت ان سے قرض لیتے جسے وہ تنخواہ کے روز وصول کر لیتے۔ لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھتے کہ کسی کو اس قرض اور اس کی ادائیگی کے بارے میں کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔

قومی آواز بند ہونے کے بعد ہم لوگ ان سے ملنے جب بھی ان کے گھر جاتے وہ باتوں باتوں میں یہ ضرور پوچھتے کہ دفتر بند ہونے پر معاوضے کے طور پر جو پیسے ملے تھے ان کا تم نے کیا کیا۔ کسی بہتر اور محفوظ جگہ پر ان کا استعمال کیا یا یوں ہی اڑا دیا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی دہلی

سے باہر ہے اور وہاں سے بذریعہ فون ان کی خیریت دریافت کر رہا ہے اور ان کو پتہ چل گیا کہ وہ بیرون دہلی سے فون کر رہا ہے تو ڈانٹ دیتے کہ وہاں سے فون کر کے کیوں اپنا پیسہ برباد کر رہے ہو، جب یہاں آنا تب معلوم کر لینا۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اگر کسی سے لڑائی ہوئی ہے، جو کہ عموماً ہوتی رہتی تھی، تو وہ زیادہ دن بغیر بولے نہیں رہ پاتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے اس سے ضرور بات کرتے تھے۔ بعض اوقات تو کچھ لوگ ان سے بدتمیزی سے بھی پیش آجاتے اس کے باوجود وہ زیادہ دنوں تک ناراض نہیں رہتے۔

بہر حال موہن چراغی ایک ایسے صحافی تھے جن کی زندگی ہجرت میں گزری۔ البتہ انھوں نے قومی آواز کے علاوہ کسی اور اردو اخبار میں ملازمت نہیں کی۔ انھوں نے حالات کے جبر کے آگے جھکتے ہوئے کشمیر کو خیر باد کہا تھا اور دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ لیکن وہ یہاں اپنا کوئی گھر نہیں بنا سکے۔ پہلے سرکاری فلیٹ میں رہے۔ پھر کرائے کے فلیٹ میں اور پھر اپنی بیٹیوں کے فلیٹ میں رہتے رہے۔ پیدا کشمیر میں ہوئے، کرم بھومی دہلی کو بنایا اور آخری سانس کلکتہ میں لی۔ جہاں ان کی بھی سسرال ہے اور ان کی بیٹی کی بھی۔ ان کی موت پر جو پہلا جملہ میری زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ آج صحافت کا چراغ گل ہو گیا۔

☆☆

ظفر عدیم

(خانماں خراب حیات)

اگر شرافت میں جان پڑ جائے تو اس کی شبیہ بالکل ظفر عدیم جیسی ہوگی۔

جی ہاں وہی ظفر عدیم جو ایک صحافی، ایک شاعر، ایک ادیب، ایک ناول نگار، ایک کہانی نویس، ایک مترجم تھے اور ان سب سے بڑھ کر ایک انتہائی شریف النفس انسان تھے۔ ۱۶ نومبر ۲۰۱۳ء کو نماز مغرب سے کچھ قبل تقریباً پانچ بجے جب قومی آواز کے ہمارے ایک ساتھی کفیل نعمانی نے فون پر ایک منحوس خبر سنائی اور کہا:

''ابھی ابھی ظفر عدیم صاحب کے گھر سے فون آیا ہے کہ ان کا انتقال ہوگیا''۔

تو یقین نہیں آیا، میں نے بار بار پوچھا: ''ارے کیا کہہ رہے ہیں؟ اپنے ظفر عدیم''؟

''ہاں ہاں! اپنے ظفر عدیم''۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

اس وقت میرے پاس ہم لوگوں کے ایک اور مشترک دوست جناب ذکیر الدین ذکی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو میں نے بتایا تو میری طرح ان کے بھی پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ میں نے کفیل صاحب سے کہا:

''اگر چہ ہم لوگ ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن پھر بھی ذرا آپ ان کے گھر فون کر کے کچھ ضروری کوائف معلوم کر لیجیے تا کہ میں ایک خبر یو این آئی اردو نیوز سروس اور اردو اخباروں کو ارسال کر دوں''۔

اس درمیان میں نے قومی آواز سے وابستہ اور غیر وابستہ بہت سے صحافی دوستوں کو یہ منحوس خبر سنائی اور ساتھ ہی میں افسوس بھی کرتا رہا کہ لوگوں کو یہ تکلیف دہ خبر سنانے کی ذمہ داری میرے اوپر آپڑی ہے۔ میں نے ایک خبر تیار کی اور یو این آئی کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں اردو کے اخباروں کو میل کر دی۔ اس اثنا میں بہت سے صحافیوں کے فون میرے پاس آنے لگے۔ دراصل وہ اس خبر کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ میں بھی انہی کی مانند جامعہ نگر کے ذاکر نگر میں رہائش پذیر ہوں اس لیے لوگوں کا میرے پاس فون کرنا فطری تھا۔ اس دوران موبائیل کی گھنٹی پھر بجی۔ لائن پر ماہنامہ ''آجکل'' کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی تھے۔

''سہیل بھائی میں ظفر عدیم صاحب کے گھر سے بول رہا ہوں۔ ان لوگوں نے رات میں دس بجے تدفین کا وقت رکھا ہے۔ اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی ہوگی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ اور پہلے تدفین کر دی جائے۔ آپ ذرا آکر ان لوگوں کو سمجھایئے''۔ انھوں نے کہا۔

خبر میل کرنے کے بعد میں ظفر عدیم صاحب کے گھر گیا۔ وہاں ان کے بھانجے ملے۔ میں نے کہا: ''میت کی تدفین میں عجلت کرنی چاہیے۔ آپ لوگوں نے اتنی تاخیر سے تدفین کا پروگرام کیوں بنایا''۔

''معاملہ یہ ہے کہ ان کے بیٹے عزیر چنڈی گڑھ سے آرہے ہیں۔ ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ ان کے بغیر کیسے تدفین کر دی جائے۔ حالانکہ ان کی بیٹی رات میں دو بجے پہنچیں گی''۔ انھوں نے وجہ بتائی۔ بہر حال کیا کیا جا سکتا تھا سوائے اس کے کہ انتظار کیا جائے۔

''ظفر عدیم صاحب تو ٹھیک ٹھاک تھے اچانک کیسے انتقال ہو گیا؟''۔ میں نے پوچھا۔

''وہ تین بجے غسل خانے میں نہانے گئے تھے۔ نہا کر نکل رہے تھے۔ دروازے کی چٹخنی کھولی ہی تھی کہ دل کا دورہ پڑا اور وہیں گر گئے۔ ان کو قریبی لائنس اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہاں لانے سے قبل ہی ان کی روح جسم سے پرواز کر چکی ہے''۔ انھوں نے بتایا۔

اس درمیان ان کے برادر نسبتی جناب مراد صاحب گھر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ عزیر کو پہنچنے میں کافی تاخیر ہے۔ کب تک انتظار کیا جائے گا۔ اب نماز جنازہ پڑھ کر تدفین کر دینی چاہیے۔ انتظار جب طویل ہونے لگا اور یہ بات معلوم ہوئی کہ راستے میں

ٹریفک جام ہے پتہ نہیں وہ کب پہنچیں تو گیارہ پونے گیارہ بجے بٹلہ ہاؤس کے قبرستان میں تدفین کردی گئی۔عزیر رات میں ساڑھے گیارہ بجے پہنچے۔ بہرحال وہ نماز جنازہ اور تدفین میں شریک نہیں ہو سکے۔ سردی کا موسم، رات کا وقت، اخباری دفتروں میں صحافیوں کی مصروفیت، اس کے باوجود خاصے لوگ تدفین میں پہنچ گئے اور ایک بے حد ذہین، شریف اور وضعدار انسان کے یوں اچانک دنیا کو خیرباد کہہ دینے پر اظہار غم کرتے رہے۔ نماز جنازہ اور تدفین میں صحافت اور ادب کی متعدد شخصیات موجود تھیں۔

ظفر عدیم انتہائی خوش شکل، خوش پوش، خوش گفتار اور خوش رفتار تھے۔ اوسط قد اور اوسط جسم کے مالک۔ چال میں شرافت۔ نگاہیں نیچے کیے چلتے، جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہے ہوں۔ شاید انھیں اس مروت اور محبت کی تلاش تھی جو موجودہ زمانے میں کمیاب ہو گئی ہیں۔ ان کی طبیعت میں بھی نستعلیقیت تھی اور انداز گفتگو میں بھی۔

وہ ایک کم آمیز انسان تھے۔ کم گوئی اور خاموشی ان کی مخصوص اداؤں میں شامل تھیں۔ وہ جس طرح زندگی بھر خاموشی کے ساتھ جیتے رہے اسی طرح خاموشی کے ساتھ راہی ملک عدم بھی ہو گئے۔ عدیم ان کا قلمی نام یا تخلص ہے اور اب وہ واقعی ''عدیم'' ہو چکے ہیں۔ ان سے میری شناسائی کا عرصہ جو دوستی تو نہیں لیکن بے تکلفی کی حدوں کو چھوتا رہا ہے، کم و بیش پچیس برسوں کو محیط ہے۔ اس دوران ان کی اور ہم لوگوں کی زندگی میں جانے کتنے اتار چڑھاؤ آئے، کتنے مد و جزر آئے لیکن وہ رشتہ جو پہلے دن قائم ہوا تھا آخر تک برقرار رہا اور اس میں استحکام ہی آتا رہا۔

میں فروری ۱۹۸۷ء میں سابق ممبر پارلیمنٹ جناب م۔ افضل صاحب کے ہفت روزہ اخبار ''اخبار نو'' سے وابستہ ہوا۔ انہی دنوں ایک روز دفتر میں ایک انتہائی خوبرو اور خوش اخلاق انسان سے ملاقات ہوئی۔ اخبار نو کے کاتب عبدالروف (مرحوم) نے ان کا تعارف کرایا:

''یہ ظفر عدیم صاحب ہیں۔ بہت اچھے صحافی ہیں۔ اخبار نو کے لیے بھی مضامین لکھتے ہیں''۔

اس وقت وہ غالباً روزنامہ ''تیج'' میں برسرکار تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے رسائل جیسے کہ ماہنامہ ''فلمی ستارے'' اور ماہنامہ ''جرائم'' میں بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق ماہنامہ ''روبی''

سے بھی رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ دور اُن کے لیے جدوجہد کا دور تھا تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ ملاقات رفتہ رفتہ بے تکلفی میں بدلتی رہی اور جب میں ۱۹۹۵ء میں روزنامہ ''قومی آواز'' میں پہنچا، اس وقت وہ وہیں کام کر رہے تھے، تو اس کے بعد باہمی رشتے میں قربت آتی گئی اور میرے سامنے ظفر عدیم کی اس شخصیت کی پرتیں، جس کو دکھانے کے بجائے چھپانے میں انھیں زبردست ملکہ حاصل تھا، بتدریج کھلتی چلی گئیں۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ سچ بات یہ ہے کہ ان کو اچھی طرح کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ جو بظاہر نظر آتے تھے اس سے کہیں الگ تھے۔ ان کی دو شخصیتیں تھیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ظاہری شخصیت دنیا کے لیے تھی۔ باطنی میں وہ کسی کو جھانکنے بھی نہیں دیتے تھے۔ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے انھیں پوری طرح سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں بیشتر لوگ انھیں ایک صحافی ہی سمجھتے رہے ہیں۔ جبکہ سچائی یہ ہے کہ وہ پہلے شاعر و ادیب تھے بعد میں صحافی۔ صحافت کا پیشہ تو انھوں نے معاش کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ورنہ وہ تو صرف ادب کی خدمت کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بدرجہ مجبوری کچھ اور کام کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ کسی اور کام کے لیے بنا ہوتا ہے۔ یہی صورت حال ان کے ساتھ بھی تھی۔

دہلی ایسی سرزمین ہے جو کسی بھی باہری شخص کو فوراً قبول نہیں کرتی۔ دو ایک بار اسے واپس کرتی ہی ہے۔ ظفر عدیم بھی ایک بار دہلی آکر واپس جا چکے تھے اور دوبارہ جب آئے تو بظاہر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ بھی دہلی کی فطرت ہے کہ اگر کسی کو ایک بار پکڑ لے تو لپٹا لیتی ہے، پھر نہیں چھوڑتی۔ ان کو بھی اس نے نہیں چھوڑا۔ حالانکہ وہ تاحیات NOSTALGIA میں مبتلا رہے۔ وہ جسمانی طور پر تو دہلی میں رہے لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر اپنے وطن مظفر پور، بہار میں رہے۔ جب بھی اپنے وطن جاتے جلد لوٹ کر نہیں آتے۔ وہاں ان کے متعدد ادبی دوست اور رفیق تھے جن کی ہم نشینی سے ان کے ادبی ذوق کو جلا ملتی اور ان کے ہم مجلس دوست بھی ان کو خود سے جدا کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ مظفر پور کی ادبی مجلسوں کی جان ہوا کرتے اور ان کا کہنا تھا کہ وہ جب مظفر پور جاتے ہیں تو ادب کی محفلیں سج اٹھتی ہیں اور وہ ایک طرح سے ان محافل کے دولھا ہوا کرتے ہیں۔

ظفر عدیم جب پہلی بار دہلی آئے تو جامع مسجد کے سامنے واقع حاجی ہوٹل میں ان کا قیام رہا۔ ان کے ہمراہ ان کے ایک بے حد قریبی دوست منظر اعجاز بھی تھے۔ لیکن جلد ہی وہ لوگ بہار واپس چلے گئے۔ وہ دوبارہ پھر دہلی آئے اور اس بار انھیں روزنامہ تیج میں ملازمت مل گئی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اخبار تیج صحافت کی قلمرو میں داخل ہونے کے سلسلے میں ان کے لیے پہلا زینہ ثابت ہوا۔ پھر تو وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ دہلی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص میں کام کرنے کی صلاحیت اور لگن ہے تو وہ اسے بھوکا نہیں مرنے دیتی۔ کہیں نہ کہیں اسے کام مل ہی جاتا ہے اور ملتا رہتا ہے۔ اور ظفر عدیم تو ایک باصلاحیت شخص کا نام تھا۔ ایک بار دروازہ کھلا تو پھر کبھی بند نہیں ہوا۔ آخری وقت تک کام کے دروازے ان کے لیے کھلتے رہے۔ جدہ، سعودی عرب سے شائع ہونے والے روزنامہ "اردو نیوز" کے لیے دہلی سے جناب شاہد پرویز نمائندگی کرتے ہیں۔ پہلے میں نے کئی برسوں تک ان کے معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ لیکن چار پانچ سال قبل جب اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں نے معذرت کر لی تو وہ کام ظفر عدیم کرنے لگے اور آخر تک کرتے رہے۔

دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے قبل وہ قسمت آزمانے ممبئی بھی گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں فلمی دنیا میں کہانی یا مکالمے لکھنے کا چانس مل جائے گا۔ لیکن ممبئی کی فلم نگری بڑی ظالم ہے۔ صلاحیت کو اس وقت تک نہیں پہچانتی جب تک کہ وہ کسی گاڈ فادر کے شانوں پر سوار نہ ہو۔ ایک بار اس مسئلے پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے پوچھا:

"ظفر عدیم صاحب آپ ممبئی سے کیوں واپس آ گئے۔ کچھ دن جد و جہد کر لیتے تو ممکن ہے کہ کہیں چانس مل جاتا"۔

"سہیل صاحب ممبئی کی فلم نگری میں ہم جیسے جانے کتنے مارے مارے پھرتے ہیں"۔ مسکرا کر بولے۔

"آپ تو ماشاء اللہ بہت ہینڈسم اور وجیہ ہیں۔ اداکاری میں ٹرائی نہیں کی؟"۔

"آپ کو معلوم ہے، متھن چکرورتی جیسے خوبصورت آدمی کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے؟ ہم لوگ تو کسی شمار و قطار میں بھی نہیں ہیں"۔ انھوں نے جواب دیا۔

اس سچائی کے باوجود کہ صحافت ان کی ضرورت تھی شوق نہیں، وہ ایک اچھے صحافی تھے۔ قومی آواز جب تک نکلتا رہا وہ اس کا بین الاقوامی صفحہ تیار کرتے رہے۔ اس معاملے میں وہ کسی کی مدد لینے کو تیار نہیں تھے۔ پورا صفحہ خود ہی بناتے۔ وہ ایک حسن پرست انسان تھے لہٰذا خبروں میں بھی حسن کاری کرتے اور ایسی خبریں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بناتے جن میں قاری کی دلچسپی ہو۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر ایک ادیب تھے اس لیے اس صفحے میں ادبی چاشنی بھی ہوتی۔ وہ بہت دنوں تک بین الاقوامی سیاست پر ایک کالم بھی لکھتے رہے۔ جسے قارئین چٹخارے لے لے کر پڑھتے۔ بین الاقوامی سیاست پر ان کی گہری نظر تھی۔ بالخصوص مسلم اور اسلامی ملکوں کے حالات پر لکھتے وقت وہ جو تجزیہ کرتے وہ لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوتا۔ ان کے صفحے کے لیے دو ایک کاتب مخصوص ہوتے۔ وہ ان کو فٹافٹ خبریں بنا کر دیتے۔ کسی کو بیکار بیٹھنے نہیں دیتے۔ ان کو اس کا بھی بہت صحیح اندازہ تھا کہ کتنی خبریں کتابت کرائیں کہ صفحہ مکمل ہو جائے۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ خبریں کم پڑ جائیں یا کچھ زیادہ ہی بچ جائیں۔ وہ اپنا صفحہ خود ہی مسطر پر جوڑتے۔ صفحہ سازی کے بعد دو ایک لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتے اور اپنے دلچسپ اور مخصوص انداز گفتگو سے لوگوں کی تفریح طبع کا سامان کرتے۔

ان کو قومی آواز میں ہمیشہ یہ احساس رہا کہ انھیں ان کی اہلیت کے پیش نظر جو پوزیشن ملنی چاہیے وہ نہیں ملی۔ وہ ایک وضعدار اور شریف انسان تھے اس لیے ایڈیٹر سے کچھ نہیں کہتے۔ سب خاموشی سے سہہ جاتے۔ لیکن تھے زود حس اور زود رنج۔ اس لیے ان حالات کا ان کی زندگی پر بھی اثر پڑا۔ قومی آواز سے چیف سب ایڈیٹر کے عہدے سے سبکدوش ہونے والے سینئر صحافی سید منصور آغا دوران گفتگو کہنے لگے:

"اگر ان کو ان کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری تفویض کی جاتی تو اس کو نہ صرف یہ کہ وہ بحسن وخوبی انجام دیتے بلکہ اس کام میں چار چاند بھی لگا دیتے۔ مثال کے طور پر وہ چونکہ ایک ادیب تھے اس لیے اخبار کا ادبی ضمیمہ بھی بہت اچھا نکال سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ضمیمہ کے انچارج جناب فرحت احساس نے ضمیمہ کو بہت معیاری بنایا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ظفر عدیم کو ایسا کوئی کام ملتا تو وہ بھی انتہائی معیاری ہوتا۔ بین الاقوامی صفحہ کے قاری

آج بھی اس بات کی شہادت دیں گے کہ وہ بہت معیاری، بھرپور اور دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ ان کو فلموں سے بھی زبردست شغف تھا۔ فلمی مضامین بہت عمدہ لکھتے تھے۔ اگر فلمی صفحات کی ذمہ داری ان کو مل جاتی تو وہ یہ کام بھی بہت اچھا کرتے''۔

لیکن ان کی خاموش مزاجی اور کچھ صلاحیتوں کو نظر انداز کرنے کی موہن چراغی کی عادت، کہ ظفر عدیم کو قومی آواز میں ان کی صلاحیت ولیاقت کے مطابق کام نہیں ملا۔

وہ سگریٹ نوش تھے۔ لیکن پیکٹ والی سگریٹ کبھی نہیں پیتے۔ بلکہ کاغذ پر تمباکو لپیٹ کر بنانے والی سگریٹ پیتے۔ کام کے دوران بھی اور کام کے بعد بھی وہ اس شغل میں مصروف ہو جاتے۔ جناب موہن چراغی، جناب شاہد پرویز اور جناب سید اجمل حسین بھی اکثر اوقات ان کے پاس بیٹھ کر اس شغل سے لطف اندوز ہوتے۔ قومی آواز میں ورکرس یونین کے الیکشن کے دوران وہ پس پردہ سرگرم ہو جاتے۔ کئی بار یونین کے صدر منتخب ہونے والے جناب عبدالحئی عرف خرم قیومی کے مطابق ''ظفر عدیم یونین کے الیکشن میں کنگ میکر کا کام کرتے''۔ وہ ایک طرح سے عبدالحئی کے مشیر خاص ہوا کرتے تھے۔

ظفر عدیم کے نزدیک صحافت بھی ایک ادب ہے لیکن وہ صحافت جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا رنگ ہو۔ انھوں نے ایک مضمون ''صحافت میں ادب کی پیشکش'' میں جو کہ کچھ دنوں قبل دہلی کے روزنامہ ''ہندوستان ایکسپریس'' میں شائع ہوا تھا، لکھا ہے:

''...... بیشک صحافت بھی ایک ادب ہے، بشرطیکہ صحافی مولانا آزاد کی صحافت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن صدمے کی بات یہ ہے کہ اردو ادب کے علمائے کرام نے ادب پر تنقید و تحقیق کو لاد کر نہ صرف ادب سے انسانی جذبات کو چھین لیا بلکہ اس کے اثر سے صحافت بھی رفتہ رفتہ ادبیت سے محروم ہوتی چلی گئی۔ صحافت میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ اس میں انسانی جذبات کی ایک موج تہہ آب موجود ہو۔ اگر صحافت کو صرف ''خبر نگاری'' یا سیاسی یا واقعاتی موضوع کو حالات حاضرہ کے تشریحی خاکے تک محدود کر دیا جائے تو یہ نتیجہ ہوگا کہ صحافت میں ادبی چاشنی ختم ہو جائے گی۔ تب صحافی کے نجی جذبات نیوز اور میڈیا کے مروجہ آئٹموں سے مغلوب ہو جائیں گے''۔

اگر ہم ظفر عدیم کی صحافت پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ وہ اس کو مذکورہ معیار پر قائم

رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

مرحوم ایک بہت اچھے مترجم بھی تھے۔ اردو زبان، اس کی باریکیوں اور اس کی نزاکتوں پر تو انھیں عبور حاصل ہی تھا انگریزی زبان پر بھی گرفت تھی۔ اسی لیے وہ کسی بھی قسم کی تحریر کا بہت اچھا ترجمہ کر لیتے۔ انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے لیے کورس کی متعدد کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جن میں لسانیات کے ساتھ ساتھ سائنس وغیرہ کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو سمیت متعدد سیاست دانوں اور شخصیات کی تصانیف کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ سیاسی مضامین کا ترجمہ وہ بہت تیزی سے کرتے۔ وہ بہت زیادہ لکھتے تھے اسی لیے زود نویس تھے اور اسی لیے ان کی ہینڈ رائٹنگ شکستہ تحریر میں تبدیل ہوگئی تھی۔ ان کی تحریر بہت کم لوگ پڑھ پاتے۔ قومی آواز میں کچھ خاص کاتب حضرات تھے جو ان کی تحریر کے ماہر تھے ورنہ عام طور پر ان کی تحریر کو پڑھنا سب کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ اگر کبھی ہاتھ روک کر لکھتے تو تحریر میں ایک حسن نظر آتا۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ حقیقتاً ادیب تھے صحافی نہیں۔ وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں جس کا اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''سچ یہ ہے کہ میں صحافی نہیں ہوں۔ بیکاری اور بے روزگاری مجھے کھینچ کر اخباری دفتروں میں لے گئی جو مجھے گھسیٹ کر کسی کارخانے، فیکٹری یا اینٹ بھٹہ میں بھی لے جا سکتی تھی۔ صرف اخبارات یا نیوز ڈیسک سے وابستہ ہو جانا صحافی ہونے کی دلیل نہیں ہے''۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں چاہتا تو خود کو صحافی کہہ کر خوش ہو لیتا لیکن میں نے یہ خوش فہمی کبھی نہیں پالی۔ ان کی یہ بات درست ہے کہ صرف اخبار میں کام کر لینے سے کوئی صحافی نہیں ہو جاتا۔ آج اخباروں میں ایسے بہت سے لوگ کام کر رہے ہیں جو صحافت کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں لیکن خود کو ''صحافی اعظم'' تصور کرتے ہیں۔

ظفر عدیم کے ادیب ہونے کا ثبوت ان کی ادبی تحریریں اور ادبی تصانیف ہیں۔ صحافت میں آنے سے قبل ہی وہ ادبی میدان میں داخل ہو گئے تھے۔ جن دنوں وہ روزنامہ تیج میں ملازمت کر رہے تھے ماہنامہ ''جرائم'' میں ان کا قسط وار ناول شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اس کے

بعد بھی جاری رہا۔ ناول نویسی کے ساتھ ساتھ وہ میدان سخن میں بھی ہاتھ آزماتے رہے۔ لیکن مزاج میں درویشی اور گوشہ گیری کی وجہ سے مشاعروں سے دور دور رہے۔ ہاں علاقے کی شعری نشستوں میں ضرور شریک ہوتے۔ اگر وہ مشاعروں میں جاتے تو بہت پہلے انھیں ملک گیر شہرت حاصل ہو چکی ہوتی۔ ۱۹۷۷ء ہی میں ان کے دو ناول ''انجو'' اور ''رات کے آنچل میں'' شائع ہو کر منظر عام پر آگئے تھے۔ ایک ناول ''شوفر'' ۲۰۰۷ء میں، دوسرا ناول ''سڑک سیدھی جاتی ہے'' ۲۰۰۸ء میں اور جاسوسی ناول ''یاسمین'' بھی ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۱۱ء میں کہانیوں کا مجموعہ ''پھول اور خوشبو'' اور ۲۰۱۲ء میں خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ''ہر چہ باداباد'' شائع ہوا۔ جبکہ ۲۰۰۳ء میں شعری مجموعہ ''بھینی بھینی مہک'' ۲۰۰۸ء میں منظوم ڈراما ''لالہ رخ'' اور ۲۰۰۹ء میں ''دیوان عدیم'' شائع ہوا۔ تین کتابیں پہاڑیاں بول اٹھیں (جاسوسی ناول)، اڑان (ناول)، بانگ درا کا عروضی نظام (شاعری کے عددی فارمیٹ) زیر طبع تھے کہ وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

''ظفر عدیم: ایک سخن ساز اور معاصر غزل کا منظر نامہ'' کے مصنف ڈاکٹر منظر اعجاز کے مطابق، جن کے بارے میں ظفر عدیم نے لکھا ہے کہ جن تین ہستیوں نے ان کی زندگی پر عظیم احسانات کیے ہیں ان میں تیسری ہستی منظر اعجاز کی ہے:

''میرا ذاتی خیال ہے کہ ظفر عدیم کی بے پناہ ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے اور ادبی ذوق کو نکھارنے میں مسلم کلب اور بزم فیض (مظفر پور) نے اہم کردار ادا کیا''۔

جہاں تک ان کے ناولوں کی بات ہے تو انھیں ان کی شاعری کی مانند مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ناول تو ہیں لیکن اول درجے کے نہیں ہیں۔ ان کے انتقال کے چند روز بعد غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، دہلی میں منعقدہ ایک تقریب کے موقع پر معروف ناول نگار جناب مشرف عالم ذوقی سے ملاقات ہوئی۔ ظفر عدیم کے بارے میں گفتگو چھڑ گئی۔ انھوں نے ان کی شخصیت و صلاحیت کی بہت تعریف کی لیکن یہ بھی کہا:

''میں نے ان کے ایک حالیہ ناول پر تبصرہ لکھا ہے۔ وہ ناول اگرچہ اچھا نہیں ہے لیکن میں نے اس کی تعریف کی ہے''۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو وہ بہت توانا ہے۔ لیکن ان کی منکسر المزاجی اور کم آمیزی اور اس کے ساتھ ساتھ گوشہ نشینی کی عادت نے ان کی شاعری کو عصری ادبی منظر نامے پر ابھرنے نہیں دیا۔ اگر ان کے مزاج میں موجودہ عہد کی چالاکیاں ہوتیں تو آج وہ صف اول کے ناول نگار اور شاعر ہوتے۔

ظفر عدیم عہد حاضر کے نقادوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ صحافت کے تعلق سے اظہار خیال میں انھوں نے نقادوں کے بارے میں جو کچھ اجمالاً کہا ہے اپنے ایک مضمون میں اس کو تفصیل سے پیش کیا ہے یعنی انھوں نے اس کی تشریح کی ہے۔ ''ہر چہ باداباد'' میں شامل ایک مضمون ''فرد نہیں فارمولہ'' میں لکھتے ہیں:

''اردو ادب کی ہر صنف وصنعت پر نقادوں کا قبضہ ہے۔ کالج یونیورسٹی کے جتنے اردو ٹیچر ہیں سب ماشاء اللہ نقاد ہیں اور ان کا سلسلہ کسی نہ کسی ماہر اقبالیات، ماہر غالبیات، ماہر عروضیات، ماہر واہیات سے ہے۔ کوئی کچھ بھی لکھتا ہے وہ ادبی مضمون نقاد صاحب کے مقالے، مضمون سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ وہی پیمانہ طے کریں گے کہ خاکہ کیا ہے اور انشائیہ کیا ہے''۔

جب ان کا شعری مجموعہ ''بھینی بھینی مہک'' منظر عام پر آیا تو انھوں نے مجھے اس پر تبصرہ لکھنے کے لیے دیا۔ ان کی شدید خواہش کے پیش نظر میں نے اس پر اظہار خیال کیا جو روزنامہ قومی آواز میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا پہلا اقتباس پیش ہے تا کہ ان کی شاعری پر کچھ روشنی پڑ سکے:

''ظفر عدیم ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ وہ نازک احساسات کی شیشہ گری کرتے ہیں اور جذبات وخیالات کے تانے بانے بن کر شعر وسخن کی خوش رنگ قبائیں تیار کرتے ہیں۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو سوز وساز اور درد وداغ سے لبریز دل رکھنے والے شاعر کا مکمل تعارف ہے۔ اس مجموعہ میں تخیلات کی لطافت اور اندازِ بیان کی ملاحت برجستہ اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اس کے کھٹے میٹھے اشعار میں آبشاروں کی غنائیت ہے اور ان کے مطالعہ سے کوچۂ ذہن ودل میں ایسی خوشبودار پروائیاں چلنے لگتی ہیں جو یادوں کے دریچے چوپٹ کھول دیتی ہیں اور شاعر کے ساتھ ساتھ قاری بھی یادوں کی گزرگاہوں میں چہل قدمی کرنے لگتا ہے۔ ان اشعار میں جذبات و احساسات کی نزاکت ولطافت کا حسین امتزاج ہے۔ اس مجموعہ میں شامل غزلیں اور نظمیں یہ

راز فاش کر دیتی ہیں کہ شاعر نے سوز دروں کی حدت اور شدت میں تپ کر ہی اپنے خیالات و احساسات کو شعر وسخن کے قالب میں ڈھالا ہے۔ شاعر کے کلام میں تجربات کی دھوپ بھی ہے اور زمانے کی سنگ دلی کے مظاہر بھی ہیں۔ احساس ناکامی ونامرادی بھی ہے مگر اس پر افسردگی نہیں ہے۔ شاعر تجربات کے پھول کو شاعری کی ڈور میں پروتا ہے اور پھر اس کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے''۔

جب ۲۰۰۹ء میں ان کا دیوان شائع ہوا تو وہ بھی اظہار خیال کے لیے دیا اور اس بار انھوں نے ایک جدت سے کام لیا۔ یعنی کتاب کے ساتھ ساتھ ایک خط بھی تحریر کیا۔ ۱۰ نومبر ۲۰۰۹ء کو تحریر کردہ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا:

''آپ کی خدمت میں دیوان عدیم کی دو جلدیں ارسال کر رہا ہوں۔ تبصرہ لکھ کر کتاب نما میں چھپوا دیجیے گا، مہربانی ہوگی۔ التجا یہ بھی ہے کہ تبصرہ میں میری ان مطبوعات کا بھی ذکر کر دیں تو اچھا رہے گا جن مطبوعات کا تذکرہ میں نے دیباچے میں ''میری اب تک کی مطبوعات'' عنوان کے تحت کیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ ایک بھرپور تبصرہ ضرور لکھ دیجیے گا اور DAMAGE کم کیجیے گا۔ شعری مجموعے تو چھپتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادھر کافی عرصے سے کوئی دیوان نظر نہیں آیا۔ اسے بھی ہائی لائٹ کر دیجیے گا۔

آپ کا بے روزگار، بیکار، فالتو، بیمار دوست ظفر عدیم''۔

افسوس کہ مضمون کی ابتدا کرنے کے باوجود میں اسے مکمل نہیں کر سکا تھا۔

ظفر عدیم کے چہرے پر مردانہ حسن کے ساتھ ساتھ شرم وحیا کا رنگ بھی غالب تھا۔ وہ ایک بے حد نستعلیق قسم کے انسان تھے۔ پسند وناپسند میں معیار کا خیال رکھتے۔ لیکن دہلی نے ان سے ان کی شگفتگی اور کسی حد تک ان کی نستعلیقیت چھین لی۔ بقول مشرف عالم ذوقی:

''میں نے مظفر پور میں جس ظفر عدیم کو دیکھا تھا وہ دہلی میں مجھے کہیں نظر نہیں آیا''۔

دراصل بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کو ان کی اہلیت کے مطابق سماج میں مقام نہیں مل پاتا۔ اور بہت سے ناکارہ لوگوں کو دنیا سر آنکھوں پر بٹھا لیتی ہے۔ ظفر عدیم بھی اسی معاشرتی امتیاز کے شکار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ناکام ابتدائی ازدواجی زندگی

نے ان کی شخصیت میں مایوسی اور جھنجھلاہٹ پیدا کردی۔ دہلی آنے کے کچھ دنوں کے بعد انھوں نے پرانی دہلی کی ایک خاتون سے شادی کر لی تھی۔ لیکن دونوں کے مزاج میں بعد المشرقین تھا۔ ان کی اہلیہ ان پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کرتیں۔ نتیجتاً باہمی اختلافات اس درجہ پہنچ جاتے کہ ان میں لڑائی جھگڑا ہونے لگتا۔ اس صورت حال نے ان کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا۔ ازدواجی ناآسودگی کی وجہ سے ان کے اندر ایک قسم کی بے راہ روی بھی آ گئی جس کا مشاہدہ ان کے شعری مجموعہ ''بھینی بھینی مہک'' میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس دوران وہ دو بیٹیوں کے باپ بھی ہو گئے۔ لیکن ازدواجی اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ بالآخر دونوں میں طلاق ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد ایک روز انھوں نے مجھ سے ملاقات کی اور رازدارانہ انداز میں مگر شرماتے ہوئے بتایا کہ وہ دوسری شادی کرنے والے ہیں جس میں بس چند افراد ہی شریک ہوں گے۔ آپ کو، عبدالحئی کو، ذکیرالدین کو اور دو ایک اور لوگوں کو بلایا ہے۔ فلاں دن صبح دس بجے ذاکر نگر کے فلاں مکان میں پہنچ جایئے گا۔ ہم اور جناب ذکیرالدین فیملی کے ساتھ پہنچے۔ جناب عبدالحئی صاحب قاضی جی کو لے کر آ گئے۔ بٹلہ ہاؤس میں قاضی جی کی SAUD کے نام سے جوتوں کی دکان ہے جسے اب ان کے پوتے چلاتے ہیں۔ انھوں نے ان کا نکاح پڑھایا۔ رجسٹر پر میرا اور ذکیرالدین صاحب کا نام ظفر عدیم صاحب کی طرف سے گواہ کی حیثیت سے درج ہوا۔ عبدالحئی صاحب کا غالباً ولی کی حیثیت سے۔ اس طرح وہ رنجیت نگر (پٹیل نگر) سے ذاکر نگر آ کر رہنے لگے۔ جس خاتون سے انھوں نے شادی کی وہ ان کی بیوہ سلیج تھیں۔ (وہ اب ایک بار پھر بیوہ ہو گئیں)۔ ان کی سابقہ اہلیہ نے مقدمہ کر دیا۔ وہ جیت گئیں۔ عدالت نے ظفر عدیم کو حکم دیا کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو ہر ماہ نان نفقہ ادا کریں۔ اس حکم پر وہ تاحیات عمل پیرا رہے۔ بیٹیوں سے ان کا تعلق برقرار رہا۔ بلکہ ان کی شادیوں کے انتظامات میں بھی وہ شریک رہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ بتاتے بھی رہے کہ اب بڑی بیٹی کی شادی ہوگئی ہے اور اب چھوٹی بیٹی کی ہوگئی ہے۔ شادی سے قبل یہ بھی بتاتے رہے کہ اب وہ دونوں فلاں فلاں کلاس میں پہنچ گئی ہیں۔

ابتدائی ازدواجی زندگی کی ناخوشگواری نے ان کے اندر اضطراری کیفیت پیدا کر دی۔ چونکہ وہ بہت حساس، زودرنج اور زود حس تھے لہٰذا یہ کیفیت ان پر غالب آ گئی۔ یہاں تک کہ قومی

آواز میں ملازمت کے دوران ایک باران پر ''دیوانگی'' کادورہ پڑا۔انھوں نے دفتر جانابند کر دیا۔ پراگندہ سے رہنے لگے۔بعض اوقات لنگی اور بنیان میں ذاکر نگر کی سڑکوں پر گشت بھی لگاتے اور کبھی کبھار اسی عالم خود فراموشی میں ذاکر نگر سے آشرم اور نظام الدین تک پیدل چلے جاتے۔ انھوں نے قومی آواز سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرلیا۔لیکن ایڈیٹر موہن چراغی نے استعفیٰ منظور نہیں کیا۔ان کے ساتھ ساتھ سید منصور آغا وغیرہ نے بھی ان کو سمجھایا۔رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہونے لگی اور ان کی طبیعت اعتدال پر آگئی۔میں اس کی تصدیق نہیں کرسکتا لیکن بعض شناساؤں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اس دوران DUST لینا شروع کر دیا تھا۔بہر حال وہ اس کیفیت سے باہر آگئے۔لیکن جو FRUSTRATION ان پر غالب آگئی تھی وہ آخر وقت تک کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی۔

وہ شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کے بہت بڑے مداح بلکہ عقیدت مند تھے۔اپنی چال ڈھال، بول چال، انداز و اطوار اور ہیئر اسٹائل میں انہی کی نقالی کرتے اور خاص طور پر جب کسی خاتون سے ملنے جاتے تو خود کو دلیپ کمار کے اسٹائل میں پوز کرتے۔

ان کا انداز گفتار بہت دلفریب تھا۔متبسم گفتگو کرتے۔ایک بار ہمارے ایک دوست نے روزنامہ اخبار نکالنے کا ارادہ کیا اور کہا کہ دو لوگوں کی خدمات ہمیں چاہئیں۔ایک سہیل انجم کی اور دوسری ظفر عدیم کی۔میں انھیں لے کر ظفر عدیم کے گھر گیا۔رمضان کے مقدس مہینے کی آمد آمد تھی۔باتیں طے ہوگئیں لیکن اخبار نہیں نکلا۔اگلے سال پھر سلسلہ جنبانی ہوا پھر ظفر عدیم سے بات کی گئی۔اخبار تو نکل آیا لیکن ڈمی کی صورت میں۔ہم لوگوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ایک بار پھر اسی سلسلے میں ان سے بات چیت ہوئی تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا:

''ارے سہیل صاحب وہ مولانا ہیں اور جانتے ہیں کہ رمضان میں غربا و مساکین کی دلدہی کرنا کارِ ثواب ہے۔وہ ہم لوگوں کی دلدہی کر رہے ہیں''۔

اس کے بعد جب بھی میں ان کو فون کرتا تو ہنستے ہوئے کہتے کہ کیا مولانا صاحب یاد فرما رہے ہیں۔

وہ کثیر التحریر تھے۔ان کے کام کرنے کا وقت رات میں گیارہ بارہ بجے کے بعد شروع

ہوتا۔ صبح تک کام کرتے۔ فجر کے وقت سو جاتے۔ پھر دو پہر میں بیدار ہوتے۔ ان کا کمرہ کسی خانقاہ کی مانند تھا۔ خوشبو ان کو بہت پسند تھی۔ اس کا ذکر بھی انھوں نے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ان کے کمرے میں ہمیشہ اگربتی جلتی رہتی۔ ان کا ایک شعر ہے:

جو شمع جلی، جل جل کے بجھی، میں اس پر نیند لٹاتا تھا
اس رات کا ساتھ نبھاتا تھا جو صبح کی آس میں رہتی تھی

ان سے بذریعہ موبائل تو اکثر گفتگو ہوتی رہتی۔ آخری ملاقات تین ستمبر ۲۰۱۳ کو کفیل نعمانی کی صاحبزادی کی شادی میں ہوئی تھی۔ قومی آواز کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ پھر رات میں تقریباً گیارہ بجے ہم دونوں عظیم ڈیری بٹلہ ہاؤس سے پیدل گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے پوچھا:

''آپ کافی کمزور لگ رہے ہیں کیا وجہ ہے، بیمار تھے کیا؟''۔

''مجھے شوگر نہیں تھی، بارڈر پر تھی، میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں بڑھ نہ جائے میٹھا کھانا چھوڑ دیا اور وہ تمام پرہیز شروع کر دیا جو ایک شوگر کے مریض کو کرنا چاہیے۔ بس اس کا الٹا اثر ہو گیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ دواؤں کا ری ایکشن ہو گیا ہے۔ اب علاج چل رہا ہے، کچھ افاقہ ہے''۔ انھوں نے جواب دیا۔

جب ہم لوگ ذاکر نگر کی گلی نمبر چھ کے سامنے پہنچے تو وہاں رک کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب میں نے اجازت چاہی کہ اب آپ اپنے گھر جائیے میں اس گلی میں مڑ کر اپنے گھر جاتا ہوں تو انھوں نے ازراہ تواضع وانکساری کہا:

''چلیے میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں''۔

''ارے ایسے تو پوری رات گزر جائے گی۔ آپ مجھے چھوڑنے گلی نمبر چھ میں چلیں گے اور میں آپ کو چھوڑنے گلی نمبر ۳۵ میں جاؤں گا''۔ میں نے ہنس کر کہا۔ وہ بھی ہنسنے لگے۔ پھر دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ ان سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

وہ ۲۶ مئی ۱۹۵۰ء کو بہار کے مظفر پور میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال ۱۶ نومبر ۲۰۱۳ء کو دہلی میں ہوا۔ وہ اپنے ہر کام میں انفرادیت کے قائل تھے۔ ''ہرچہ باداباد'' میں

''التعارفُ علّت'' کے عنوان سے اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: نام: ظفر عدیم۔ اسم فراموشیدہ: محمد جاوید حسن ابن سید ابوظفر۔ جائے پیدائش: شہرغزل، مظفر پور، بہار۔ تعلیم: فارغ ابتلائے مسعات۔ استادروحانی: حضرت اسداللہ خاں غالب۔ قوت محرکہ فطریہ: شہناز رانی بیگم غزل مظفر پور۔

یہ انفرادیت پسند شخص زندگی بھر گوشہ گیر رہا اور اپنے نام عدیم کی مناسبت سے ہمیشہ معدوم ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر اس کی تمنا رنگ لائی اور اب وہ ایسی جگہ جا کر عدیم و معدوم ہو گیا جہاں اسے کوئی تلاش ہی نہیں کرسکتا۔ انہی کا ایک شعر ہے:

نصیب ہی سے ملی خانماں خراب حیات
کب اختیار تھا کرتا خود انتخاب حیات

☆☆

محمد یوسف خاں درانی

(ایسا شریف درانی؟)

میں غائبانہ طور پر نادر شاہ درانی سے واقف ہوں تو حاضرانہ طور پر محمد یوسف خاں درانی اور انیس درانی سے۔ اگر اول الذکر درانی آخر الذکر درانیوں کے مورث اعلیٰ ہیں تو مجھے یہ کہنے دیجیے کہ ان کے اندر جو کچھ شرافت رہی ہوگی وہ تمام کی تمام محمد یوسف خاں درانی میں جمع ہوگئی تھی اور اگر کچھ ظرافت رہی ہوگی تو وہ پوری کی پوری انیس درانی کی شخصیت میں منتقل ہوگئی ہے۔

نادر شاہ درانی تلوار کے دھنی تھے تو انیس درانی قلم کے دھنی ہیں۔ نادر شاہ بھی جری تھے اور انیس درانی بھی جری ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ قلم کا سپاہی تلوار کے سپاہی سے زیادہ جرأتمند ہوتا ہے۔ نادر شاہ نے اگر اپنی تلوار سے لاتعداد لاشیں گرائی تھیں تو انیس درانی نے بھی اپنے تیغِ قلم سے کشتوں کے پشتے لگائے ہیں۔ ویسے تلوار کی بہادری کوئی بہادری نہیں ہوتی۔ وہ نہتوں کے سر تو کاٹ سکتی ہے دلوں کے زخم پر پھایا نہیں رکھ سکتی۔ قلم زخم دل پر محبت کا مرہم بھی رکھ سکتا ہے اور توپ کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔ دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ قلم کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ کاری ہوتا ہے۔ تلوار کا زخم تو بھر جاتا ہے لیکن قلم کا زخم تاعمر خون کے آنسو رلاتا ہے۔

لیکن میں یہاں انیس درانی کا خاکہ نہیں اڑا رہا بلکہ محمد یوسف خاں درانی کا خاکہ لکھنے جا رہا ہوں۔ جن کی شرافت کا میں ذاتی طور پر گواہ ہوں۔

یہ ۲۸ نومبر ۱۹۹۸ء کی صبح کا واقعہ ہے۔ جب میں سو کر اٹھا تو میری اہلیہ نے کہا:

''ابو جی کا رات میں انتقال ہو گیا ابھی ساڑھے دس بجے جنازہ قبرستان لے جایا جائے گا''۔

''آپ کو کیسے معلوم؟'' میں نے پوچھا۔

''قومی آواز اخبار میں خبر چھپی ہے''۔ انھوں نے جواب دیا۔

یہ خبر سن کر حیرت نہیں ہوئی البتہ افسوس ضرور ہوا۔ حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ ابو جی کی موت کسی بھی وقت متوقع تھی۔ وہ ایک طویل عرصے سے بستر علالت پر تھے اور کئی ماہ سے نیم بیہوشی کی کیفیت میں تھے۔ افسوس اس لیے ہوا کہ ہم لوگوں کے ایک کرم فرما بزرگ اس دنیا سے اٹھ گئے اور اب ان کی صرف یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔

ابو جی، یعنی محمد یوسف خاں درانی۔ کانگریس کے سینئر لیڈر اور ہفت روزہ اخبار نو کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر جناب انیس درانی کے والد اور اخبار نو کے چیف ایڈیٹر جناب م۔ افضل صاحب کے سسر جنھیں درانی صاحب اور افضل صاحب کی دیکھا دیکھی ہم لوگ بھی ابو جی کہتے تھے۔ یوں تو وہ انیس درانی صاحب کے والد تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے ہم لوگوں کا بھی ان سے یہی رشتہ ہے۔ وہی اپنائیت، وہی محبت اور وہی پیار اور وہی خلوص جو درانی صاحب اور افضل صاحب کے لیے ان کے دل میں تھا وہی اخبار نو سے وابستہ ہم تمام لوگوں کے لیے بھی تھا۔ جب بھی ان سے بات کرتے تو یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم لوگ غیر ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ہم لوگ ان کے اتنے ہی عزیز ہیں جتنے کہ درانی صاحب اور افضل صاحب۔

ابو جی اوسط جسم اور قدرے بھاری بدن کے تھے۔ کرتا پائجامہ زیب تن کرتے اور ہمیشہ سر پر ٹوپی لگاتے۔ موٹے فریم کی عینک ان کی شناخت میں شامل۔ چال میں سبک خرامی۔ گفتگو میں نرم روی۔ شرافت ان کی پہچان تھی تو حلاوت ان کی زبان کی شان۔ وہ اخبار نو کے پہلے پرنٹر پبلشر تھے۔ اخبار نو میں ملازمت کرنے سے قبل نہ تو میں افضل صاحب سے واقف تھا، نہ درانی صاحب سے اور نہ ہی ابو جی سے۔ لہٰذا ابو جی سے جو بھی رشتہ قائم ہوا وہ اخبار نو کے تعلق سے ہوا۔ میں نے ابو جی کو درانی صاحب کے ساتھ ساتھ افضل صاحب اور اخبار نو کی بے انتہا فکر کرتے دیکھا۔ افضل صاحب اور اخبار نو سے ان کی ایسی جذباتی وابستگی تھی کہ اخبار نو کے دفتر میں پہلی بار آنے والا یہی سوال کرتا:

"کیا ابو جی افضل صاحب کے والد ہیں؟"۔

اور جب ہم لوگ بتاتے کہ نہیں وہ ان کے والد صاحب نہیں ہیں تو لوگوں کو حیرت ہوتی۔اس قسم کا سوال کرنے والوں کی کوئی غلطی نہیں تھی۔وہ اپنی جگہ پر بالکل درست سوال کرتے تھے۔ابو جی کا افضل صاحب اور اخبار نو سے جو رشتہ تھا اور وہ جس لگاؤ سے پیش آتے اس کے پیش نظر یہ محسوس ہونا فطری امر تھا کہ ابو جی افضل صاحب کے والد صاحب ہیں۔

فروری ۱۹۸۷ء میں جب میں پہلی بار اخبار نو کے ایڈیٹوریل سے وابستہ ہوا تو کئی دنوں تک میں بھی یہی سمجھتا رہا کہ ابو جی اور افضل صاحب میں باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔لیکن ایک روز اخبار میں کتابت کرنے والے عبدالرؤف (مرحوم) نے، جو کہ اخبار کے دفتر میں رہتے بھی تھے، جب یہ بتایا:

"ابو جی افضل صاحب کے نہیں بلکہ درانی صاحب کے والد ہیں" تو مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ افضل صاحب ان کے داماد ہیں اور اس طرح وہ افضل صاحب کو بھی اپنا بیٹا ہی سمجھتے ہیں۔

ابو جی ہم تمام کارکنوں کے ساتھ یکساں محبت سے پیش آتے تھے۔الہٰ آباد کے نمائندہ سید مظفر حسین صاحب ہوں یا لکھنؤ کے نمائندہ شاہ فاروق عطا صاحب یا پھر علیگڑھ کے ایس اے بلرامی ہوں یا میرٹھ کے نمائندہ محمد ارشد۔ابو جی سب کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتے۔

اخبار نو کا دفتر جب ترکمان گیٹ پر واقع تھا تو ابو جی کا یومیہ معمول تھا کہ وہ صبح سب سے پہلے دفتر آتے۔افضل صاحب کی کرسی پر بیٹھ کر ضروری کام نمٹاتے اور اس کے بعد نزدیک ہی آصف علی روڈ پر واقع بینک آف مہاراشٹرا چلے جاتے۔چیک جمع کرتے یا پیسے نکالتے۔یہ ان کا روز کا معمول تھا۔میں نے کسی روز نہیں دیکھا کہ دفتر میں افضل صاحب کی آمد سے قبل ابو جی نے دفتر آکر کام نہ سنبھالا ہو۔انھوں نے افضل صاحب کی غیر موجودگی میں کبھی بھی ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

ان دنوں ابو جی کے ذمہ ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ ہم کارکنوں میں سے جس کو ضرورت ہوتی ہر پندرہ تاریخ کو ایڈوانس دیا کرتے۔وہ ہر پندرہ تاریخ کو بینک سے آنے کے بعد ہم

لوگوں سے پوچھتے:

''ہاں بھئی کسی کو ایڈوانس تو نہیں چاہیے''۔

ہم چند لوگوں میں سے تو شاید کسی کو کبھی کبھار ہی ایڈوانس لینے کی ضرورت پڑتی۔ لیکن عبدالرؤف کو ہر ماہ پڑ جاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ کام بہت کم کرتے اور دوسرے جو پیسے ملتے اڑا ڈالتے۔ کھانا بہت کم کھاتے۔ چائے پاپے اور اسی طرح دوسری اوپری چیزیں کھا کھا کر گزارہ کرتے۔ ظاہر ہے ان چیزوں سے پیٹ تو بھرتا نہیں۔ اس لیے ہمیشہ پیسوں کی ضرورت رہتی۔ وہ تو پندرہ تاریخ کا انتظار ہی نہیں کرتے اور دس تاریخ سے ہی ابو جی سے تقاضا شروع کر دیتے۔ دس تاریخ بھی بڑی مشکل سے آتی۔ لیکن ابو جی تھے اپنے اصول کے پابند۔ وہ پندرہ تاریخ سے پہلے ایڈوانس دینے سے گریز کرتے۔ اس لیے نہیں کہ وہ دینا نہیں چاہتے۔ بلکہ اس لیے کہ ایڈوانس ملتے ہی یہ حضرت اڑانا شروع کر دیں گے اور پھر پیسے پیسے کے محتاج ہو جائیں گے۔

عبدالرؤف کا مطالبہ جب پورا نہیں ہوتا تو وہ ہم لوگوں سے بڑی بے چارگی کے ساتھ کہتے: ''دیکھو یار ابو جی ایڈوانس نہیں دے رہے ہیں''۔

اور جب ہم لوگ ابو جی سے سفارش کرتے تو وہ یہ کہتے ہوئے ایڈوانس دینے پر راضی ہو جاتے: ''میں اس کو ایڈوانس دیتا نہیں صرف تم لوگوں کے کہنے پر دے رہا ہوں''۔

ادھر جب عبدالرؤف کو ایڈوانس مل جاتا تو ان کے انداز سے ایسا لگتا کہ جیسے وہ کسی مملکت کے شہزادہ ہیں۔ عیاشی شروع ہو جاتی۔ عیاشی کی انتہا آصف علی روڈ پر ڈیلائیٹ سنیما میں جا کر فلم دیکھنا ہوتی۔

اس وقت ابو جی کی باتوں سے تو محسوس نہیں ہوتا لیکن بعد میں اندازہ ہوتا کہ ان کے اس جملے میں کتنا خلوص پنہاں تھا۔

عبدالرؤف جیسی شخصیت میں نے دوسری نہیں دیکھی۔ وہ دہلی میں رہائش پذیر بہار کے معروف کاتب عبدالمنان شکوری کے بھتیجے اور منور شکوری کے چچا زاد بھائی تھے۔ لیکن اخبار نو کے آغاز پر جو افضل صاحب کے پاس آئے تو موت نے ہی انھیں وہاں سے جدا کیا۔ ان کے چچا ان کو بہت بلاتے کہ وہ ان کے پاس رہیں لیکن دونوں کے مزاج میں بعد المشرقین تھا۔ لیکن

بہر حال ایک بار بہت اصرار پر وہ ان کے پاس چلے گئے اور پندرہ روز کے اندر ہی رسی تڑا کر واپس آ گئے۔ اس وقت عبد المنان شکوری اکیلے رہتے تھے۔ عبد الرؤف کی واپسی کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں واپس آ گئے تو انھوں نے اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا:

"ارے بھائی ان کا نام مت لو۔ میں نے پندرہ دن کی جیل کاٹی ہے۔ وہ تو بہت بڑے جیلر ہیں۔ ان سے نباہ پانا ناممکن ہے۔ ہر بات میں ٹوکتے ہیں۔ ایسے مت کرو، ایسے مت رہو، ایسے مت چلو، ایسے مت دیکھو، ایسے مت سوؤ"۔

"ان سے اتنی چڑ کیوں ہوگئی آخر کیا وجہ ہے کچھ تو بتاؤ"۔ میں نے کہا۔

"میں بس ایک مثال دوں گا۔ وہ گھر پر ہی کھانا پکاتے ہیں ہوٹل کا کھانا نہیں کھاتے۔ لیکن جب کھانا پکاتے ہیں تو اسٹوو پر رکھی چاول کی پتیلی پر دال کی پتیلی بھی رکھ دیتے ہیں۔ پوچھنے پر کہتے ہیں کہ اس طرح ایک ہی آنچ میں یعنی کم خرچ میں دونوں چیزیں تیار ہو جائیں گی"۔

"اور بھی کچھ بتاؤ"۔ میں نے کریدا۔

"اور یہ کہ جب کپڑے دھوتے ہیں تو پینٹ اور شرٹ کو جیسے تہہ کرتے ہیں ویسے کرکے دھوتے ہیں۔ الٹتے پلٹتے نہیں۔ پوچھنے پر کہتے ہیں کہ اس طرح دھونے سے کپڑے کی کریز نہیں ٹوٹتی"۔

چچا کو باہر کے کھانوں سے نفرت اور بھتیجے کو گھر کے کھانوں سے بیر۔ چچا کپڑے خود دھوتے بھتیجے لانڈری سے دھلواتے۔ چچا احتیاط پسند اور بھتیجہ شاہ خرچ۔ کیسے بنتی۔ بالآخر بھاگ آئے۔

جب افضل صاحب ان کو کتابت کے لیے مضامین دیتے تو وہ آخری مضمون کی آخری ایک دو سلپیں روک لیتے۔ افضل صاحب پوچھتے کہ رؤف مضمون ہو گیا۔ تو وہ جواب دیتے کہ ہاں ہو گیا بس ایک مضمون ہاتھ میں لگا ہوا ہے۔

"تم ایک مضمون روک کیوں لیتے ہو سارے کتابت کرکے کیوں نہیں دے دیتے"۔ کوئی ان سے پوچھتا تو وہ کہتے:

"اس طرح دل کو تسلی رہتی ہے کہ ہم بیکار نہیں ہیں ہمارے پاس کام ہے"۔ اس وقت کارگزاری کی بنیاد پر معاوضہ ملتا تھا۔

گھر اور گھر والوں سے دور رہتے رہتے ان کے مزاج میں عجیب وغریب قسم کی کجی آگئی تھی۔شادی ہوئی تھی۔ناکام ہوگئی۔بیوی نے خلع لے لیا۔خلع کی کارروائی یہیں دہلی میں امارت شرعیہ کے قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے انجام دی۔اس موقع پر افضل صاحب، عبدالرؤف، میں اور دفتر ہی کے دو ایک لوگ اور بھی موجود تھے۔

مزاج کی کجی نے جنسی کجی کی شکل لے لی۔وہ رسائل سے فلمی اداکاراؤں کی تصاویر کاٹتے اور ان کو ایک کاغذ پر سلیقے سے چپکا کر بیچ میں اپنی تصویر چپکاتے۔یہ ان کا شوق تھا۔ہم لوگ منع کرتے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اخبار کا دفتر ترکمان گیٹ سے ساؤتھ ایوینیو، وہاں سے کوچہ چیلان اور پھر دریا گنج پہنچا۔رؤف پیچھے پیچھے۔کمپیوٹر لگ جانے کی وجہ سے ان کا کام ختم ہوگیا۔لیکن افضل صاحب اور ان کے اہل خانہ کی اعلیٰ ظرفی کہ انھوں نے انھیں جانے کو نہیں کہا۔دریا گنج میں افضل صاحب کے گھر کے ایک کمرے میں رہتے۔ کھانا بھی انہی کے گھر سے آتا۔اسی دوران وہ ٹی بی کے مریض ہو گئے۔کافی علاج معالجہ چلا۔لیکن دواؤں سے جیسے انھیں نفرت تھی۔ بالآخر وہ مرض مرض الموت میں بدل گیا۔شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے۔افضل صاحب نے ہی ان کی تکفین و تدفین بھی کی۔

بہر حال ترکمان گیٹ پر اخبار نو کا دفتر بہت چھوٹا سا تھا۔ایک کمرے پر مشتمل۔کمرے کا فرش نیچا تھا اور نصف حصے میں دو چھتی ڈال دی گئی تھی جس پر کاتب حضرات بیٹھتے اور اخبار کی فائل اور دیگر ضروری کاغذات رکھے رہتے۔لیکن دفتر جتنا تنگ تھا افضل صاحب، درانی صاحب اور ابو جی کے دل اتنے ہی بڑے تھے۔اس وقت اخبار نو اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا۔جب بھی کوئی لیڈر یا اخبار نو کا کوئی پرستار یا قاری پہلی بار دفتر آتا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا کہ اس چھوٹے سے دفتر سے اتنا بڑا اخبار نکل رہا ہے۔لوگ پوچھ بیٹھتے: ''افضل صاحب یہاں سے آپ اخبار نکال رہے ہیں۔اس چھوٹے سے اور تنگ سے کمرے سے؟''۔

اس پر افضل صاحب مسکراتے ہوئے جواب دیتے: ''جی ہاں اسی کبوتر خانے سے تو اخبار نکال رہا ہوں''۔

اخبار شروع کرنے کے کچھ دنوں بعد انھوں نے ایک ماروتی کار خرید لی۔ ایک بار ان کو ایران کے دورے پر جانا تھا۔ اس وقت تک ان کے پاس کار نہیں تھی۔ انھوں نے ہم لوگوں سے کہا: ''میں چاہوں تو ابھی کار لے سکتا ہوں۔ لیکن ایران کے دورے سے واپسی پر خریدوں گا''۔

پھر خود ہی کہنے لگے کہ حالانکہ لوگ یہی سوچیں گے کہ ایران سے خاصے پیسے ملے ہیں جس سے کار خریدی گئی ہے۔ ان کی کار کا رنگ ہرا تھا۔

ایک بار انڈین یونین مسلم لیگ کے لیڈر غلام محمود بنات والا نے دیکھا کہ افضل صاحب کی کار کا رنگ ہرا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس پر افضل صاحب نے مسکراتے ہوئے اور چٹکی لیتے ہوئے ان سے کہا:

''بنات والا صاحب میں نے ہرے رنگ کی کار اس لیے خریدی ہے تاکہ آپ جیسے لوگوں کو دھوکہ دے سکوں''۔ بنات والا صاحب اس جملے سے بہت محظوظ ہوئے۔

ان دنوں منگل کے روز اخبار کی کاپی فائنل ہوتی تھی اور عموماً ہر منگل کو رات میں گیارہ بج جایا کرتے تھے۔ میں، اخبار کو سیٹ کرنے والے خطاط ذکیر الدین صاحب اور کاتب حیدر علی صاحب جوگا بائی اوکھلا رہتے تھے۔ آخری بس رات میں گیارہ بجے دہلی گیٹ کے اسٹینڈ سے ملتی تھی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا کہ ہم لوگ اسے پکڑ پاتے۔ افضل صاحب کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ اس لیے اگر کاپی وقت سے پہلے فائنل ہو جاتی تو ہم لوگ بس سے چلے جاتے۔ حالانکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا۔ عموماً گیارہ کے بعد ہی کاپی فائنل ہو پاتی۔ افضل صاحب کی یہ اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ ہر منگل کو اپنی گاڑی سے ہم تینوں کو گھر تک چھوڑ کر جاتے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو آٹو کا کرایہ دے دیتے اور ہم لوگ اس سے گھر چلے جاتے۔ یا یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ تم لوگ جس طرح بھی چاہو جاؤ، میں نے تم لوگوں کے جانے کا ٹھیکہ تھوڑا ہی لے رکھا ہے۔ لیکن جب بھی وہ دہلی میں رہے تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے خود ہم لوگوں کو نہ چھوڑا ہو۔ حالانکہ یہ ان کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اس وضع داری کا مظاہرہ کرتے رہے۔

صحافت میں یہ میرے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اخبار نو کا دفتر صحافت کا میرا پہلا اسکول تھا اس لیے اس سے جذباتی وابستگی فطری ہے۔ اس وقت بھی میں اخبار

نو سے جذباتی وابستگی رکھتا تھا اور اب بھی رکھتا ہوں جبکہ میں اس سے فل ٹائم وابستہ نہیں ہوں۔ اخبار اور افضل صاحب سے آج بھی میرا وہی رشتہ ہے جو پہلے دن تھا۔ کسی کے ساتھ جذباتی وابستگی میں پارٹ ٹائمنگ کا کوئی تصور نہیں ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا اخبار نو کا دفتر بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے گرد وغبار اور کوڑا کرکٹ سے جلد ہی اٹ جایا کرتا تھا۔ ابو جی اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ وہ گندگی بالکل پسند نہیں کرتے۔ جب بھی وہ دفتر میں کوڑا کرکٹ دیکھتے تو کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ اوپر مچان کی طرف دیکھتے ہوئے عبدالرؤف کو ڈانٹتے ہوئے کہتے:

''تم نے دفتر کو بھٹیار خانہ بنا رکھا ہے۔ جدھر دیکھو ادھر گندگی، اسے کیوں نہیں صاف کرتے''۔

اتنا کہہ کر وہ دفتر سے چلے جاتے۔ عبدالرؤف ہم لوگوں کی جانب دیکھ کر کہتے:

''دیکھو یار گندگی پتہ نہیں کون کرتا ہے اور ابو جی مجھ کو ڈانٹتے ہیں''۔

''وہ تم کو اس لیے ڈانٹتے ہیں کہ تم سے بہت زیادہ محبت بھی تو کرتے ہیں''۔ ہم لوگ جواب دیتے۔

''پتہ نہیں محبت کرتے ہیں یا ڈانٹنے میں ان کو مزا آتا ہے''۔ وہ مایوسانہ انداز میں کہتے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔

ابو جی دن میں دو بار دفتر میں آتے۔ ایک تو صبح کے وقت اور دوسرے سہ پہر کے وقت۔ دوسری بار بھی ایک دو گھنٹے بیٹھ کر اپنا کام نمٹاتے اور پھر گھر چلے جاتے۔ جو کہ وہیں قریب ہی میں واقع تھا۔ ہاں منگل کے روز وہ گھومتے گھامتے رات میں بھی آجاتے۔ اگر افضل صاحب موجود ہوتے تو اخبار وغیرہ پڑھتے ورنہ ہم لوگوں کے ساتھ گپ شپ کر کے واپس چلے جاتے۔ ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جلدی غصہ نہیں ہوتے۔ اور اگر ہوتے تو صرف عبدالرؤف پر اور وہ بھی چند ثانیوں کے لیے۔ پھر پہلے کی مانند نارمل ہو جاتے اور دفتر سے جانے کے لیے جب اٹھتے تو کہتے ''اچھا بھئی اب تو میں چلتا ہوں''۔

دہلی میں گرمی بلا کی پڑتی ہے۔ اخبار نو کے دفتر میں اور زیادہ پڑتی تھی۔ نہ اے سی نہ

کولر۔ صرف پنکھوں سے کام چلانا پڑتا تھا۔ یہ مت سمجھیے گا کہ افضل صاحب کے کمرے میں اے سی لگا رہا ہوگا۔ نہیں وہ بھی اسی گرمی میں کام کرنے کے عادی تھے۔ اس وقت تک اے سی کا بہت زیادہ چلن بھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ دنوں تک شاہ فاروق عطا صاحب بھی اخبار نو میں فل ٹائم کام کرنے لگے تھے۔ ان کا لکھنوی مزاج۔ کہاں دہلی کی سڑی گرمی برداشت کر پاتے۔ شام کے وقت بعض اوقات سفید رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے دفتر سے نکل جاتے اور دس پانچ منٹ کے بعد واپس آتے۔ ایک بار ان کے پیچھے ہم لوگ بھی نکلے۔ وہ حج منزل کے پاس کھڑے ہوکر روح افزا کا شربت پی رہے تھے۔ وہاں گرمیوں میں اب بھی کئی ریڑھی والے روح افزا کا شربت بیچتے ہیں۔

ہم لوگوں کو دیکھا تو بلایا اور کہا: ''آیئے آیئے آپ لوگ بھی شربت پیجیے''۔

اس پر حیدر صاحب نے کہا: ''عطا صاحب ابھی تو آپ نے دفتر میں چائے منگوا کر پی ہے اور اب شربت پی رہے ہیں''۔

''ارے بھائی حیدر صاحب! چائے تو عمل بجھانے کے لیے پیتے ہیں لیکن اس کے بعد گرمی مارنے کے لیے شربت پینا پڑتا ہے''۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بہر حال میں نے ابو جی کو ہمیشہ خوش و خرم دیکھا۔ کبھی غمگین یا پریشان نہیں دیکھا سوا ایک موقع کے۔ وہ موقع تھا ہی غم واندوہ میں ڈوب جانے والا۔ اس دل دوز واقعہ نے ہم لوگوں کو بھی اندر سے جھنجھوڑ دیا تھا۔

درانی صاحب کے جواں سال بیٹے فرحان درانی کو تیراکی کا شوق تھا۔ وہ روز شام کو سویمنگ پول جاتا۔ مگر ایک روز گیا تو ایسا گیا کہ سب کی خوشیاں سویمنگ پول میں ڈبو گیا۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا کہ فرحان کی سویمنگ پول میں ڈوبنے سے موت ہوگئی ہے تو درانی صاحب کے گھر جیسے تہلکہ مچ گیا۔ اس انتہائی ذہین و فطین بچے کی اس اندوہناک موت نے، جس سے اس خاندان کو بہت زیادہ توقعات وابستہ تھیں، ابو جی کو، درانی صاحب کو اور افضل صاحب اور ان کی اہلیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہم لوگوں کو معلوم ہوا تو ہم بھی درانی صاحب کے گھر گئے۔ تقریباً مغرب کا وقت ہوگیا تھا۔ لاش تب تک آئی نہیں تھی۔ ابو جی انتہائی غمگین ہونے کے باوجود خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھنے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ گئے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں

ہونے دے رہے ہیں اور تعزیت کے لیے آنے والوں سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔

جب افضل صاحب ۱۹۹۰ء میں راجیہ سبھا کے ممبر ہو گئے اور اخبار نو کا دفتر ترکمان گیٹ سے ساؤتھ ایونیو منتقل ہو گیا تو اس وقت تک میں اخبار نو کی ملازمت چھوڑ کر دوسرا اخبار جوائن کر چکا تھا۔ اس دوران ابو جی کی بینائی کمزور ہو گئی تھی اور متعدد بیماریوں نے آ گھیرا تھا۔ جب ایک طویل عرصے کے بعد ساؤتھ ایونیو کے دفتر میں ابو جی سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے پہچان نہیں پائے۔

''میں سہیل انجم ہوں''۔ میں نے انھیں بتایا۔

نام سنتے ہی بیحد جذباتی ہو گئے۔ باتیں کرنے لگے۔ خیر خیریت پوچھنے لگے۔ یہ بھی پوچھا کہ کہاں کام کر رہے ہو۔ ان کی محبت اور اپنائیت میں اس وقت بھی کوئی کمی میں نے محسوس نہیں کی۔ اس تجدید ملاقات کے بعد پھر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

راجیہ سبھا کی رکنیت ختم ہونے کے بعد جب افضل صاحب ساؤتھ اوینو سے پٹودی ہاؤس دریا گنج میں واقع اپنے گھر میں منتقل ہو گئے تو اخبار نو کا دفتر بھی وہیں آ گیا۔ اس وقت تک ابو جی اپنے چہیتے پوتے کی موت کے غم میں مختلف امراض کے شکار ہو چکے تھے۔ ان کی شوگر بھی بڑھ گئی تھی۔ یادداشت بھی بہت کمزور ہو گئی تھی۔

آخری دنوں میں جب ابو جی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو افضل صاحب ان کو گاڑی میں لیے لیے اس اسپتال سے اس اسپتال تک ایسے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے جیسے وقت بہت کم ہے اور حقوق کی ادائیگی بہت زیادہ ہے۔ ایک اسپتال میں کچھ دنوں تک رکھنے کے بعد ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ان کو گھر لے آیا گیا۔ چونکہ ان کے اپنے آبائی مکان میں ان کی رہائش اوپری منزل پر تھی اور ڈاکٹروں نے میڈیکل نقطۂ نظر سے زینہ چڑھنے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس لیے افضل صاحب کے مکان میں گراؤنڈ فلور پر واقع دفتر کے ایک کمرے میں ان کا بستر لگا دیا گیا۔ اسی اخبار نو کے دفتر میں تقریباً ۸۳ سال کی عمر میں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی جس سے ان کی گہری وابستگی رہی ہے۔

آج ابو جی نہیں ہیں تو اخبار نو کا دفتر سونا سونا لگتا ہے۔ حالانکہ ایک طویل عرصے سے وہ دفتر سے کٹ کر رہ گئے تھے اور نیم بے ہوشی کے عالم میں ایک کمرے میں محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

لیکن پھر بھی آج نہ جانے کیوں دفتر کے ہر کمرے میں ان کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور ان کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے پیچھے کی خاموشی چیخ چیخ کر ان کی یاد دلاتی ہے اور ہم لوگوں کے پاس اس دعا کے علاوہ کچھ بھی کہنے کو نہیں رہ گیا ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

☆☆

عادل اسیر دہلوی

(ادب اطفال کا بے لوث خادم)

لمبا قد، سرخی مائل گورا رنگ، مسکراتا چہرہ، ہنستی آنکھیں، متبسم لب، ہلکی مونچھیں، کرتا پائجامہ میں ملبوس اور ہاتھوں میں کتابیں لیے دہلی کے گلی کوچوں میں خراماں خراماں چلتا ہوا ایک شخص۔ جسے دور سے دیکھ کر ہی لوگ پہچان لیتے تھے کہ ہو نہ ہو وہ عادل اسیر دہلوی ہیں۔ سامنے آتے ہی محبت آمیز انداز میں سلام کرنا اور لگاوٹ کے ساتھ گفتگو کرنا ان کا امتیازی وصف تھا۔ وہ سبک رفتار بھی تھے اور شیریں گفتار بھی۔ وضعدار بھی اور ملنسار بھی۔ وہ بجا طور پر دہلی میں ادب اطفال کے ایک اہم نمائندہ تھے۔ مگر افسوس اب وہ نہ گلی کوچوں میں نظر آئیں گے، نہ کسی سمینار میں، نہ ہی کسی چائے خانے میں۔ انھوں نے اس دنیا کو آباد کر دیا جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

۲۰ ستمبر ۲۰۱۴ء کو دن میں چار بجے صحافی مودود صدیقی نے بذریعہ فون اطلاع دی کہ عادل اسیر دہلوی نہیں رہے تو یقین نہیں آیا۔ یہ خبر بالکل غیر متوقع تھی۔ انھوں نے بتایا کہ دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا ہے۔ انھیں ایک ہفتہ قبل دل کا دورہ پڑا تھا۔ صبح چار بجے کے وقت جب لوگ میٹھی نیند میں ہوتے ہیں، دل نے حملہ کیا۔ ترکمان گیٹ پر رہتے تھے لہٰذا خود ہی ٹہلتے ہوئے قریب کے لوک نائک جے پرکاش نرائن اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں دل کے مریضوں کی تعداد زیادہ اور بستروں کی کم تھی۔ ایک ایک بیڈ پر دو دو تین تین مریض اپنے دلوں کو تھامے لیٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹروں کو اپنی پوزیشن بتائی اور داخل کرنے کی گزارش کی۔ ڈاکٹروں

نے کہا کہ ایسے کیسے داخل کر لیں۔ اپنے گھر کے کسی فرد کو بلائیے۔ شاید بستروں کی قلت کی وجہ سے وہ انھیں ٹرخانا چاہ رہے تھے۔ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ تجرد کی زندگی گزار رہے تھے۔ اہل خانہ سے ان کی دیرینہ کشیدگی تھی۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ آبائی مکان میں بھائی رہائش پذیر ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست کو فون کیا۔ وہ اسپتال پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ عادل اسیر جن کو دل کا دورہ پڑا تھا، وارڈ میں ٹہل رہے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کیا اور ان کے لیے کسی بیڈ پر ذرا سی جگہ بنوائی اور انھیں وہاں لٹا دیا۔ ڈاکٹروں نے ان کی جانچ کی۔ کچھ علاج چلا اور پھر چھٹی دے دی گئی۔ ڈاکٹروں نے ۲۳ ستمبر کو دوبارہ چیک اپ کے لیے بلایا تھا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ان کا دل بڑا خوددار تھا۔ شاید اس نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ عادل اسیر پھر اس اسپتال میں جائیں جہاں مریضوں کی کثرت اور بستروں کی قلت ہے اور دو دو تین مریضوں کے ہم بستر بنیں۔ لہٰذا اس نے احتجاج کیا اور ۲۰ ستمبر کو دھڑکنا بند کر دیا۔ دل کے آگے کس کی چلی ہے۔ سو، عادل بھی ہمت ہار گئے اور انھوں نے دل کی بیوفائی کے آگے زندگی کے سارے ہتھیار ڈال دیے۔

جب مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی تو میں پریشان کہ نماز جنازہ کے بارے میں کیسے معلوم ہو۔ اچانک ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ انہی کے موبائل نمبر پر کوشش کی جائے۔ کوشش کامیاب رہی۔ ان کے ایک قریبی دوست نظر محمد کے پاس ان کا فون تھا۔ انھوں نے بتایا کہ حج منزل ترکمان گیٹ پر واقع مسجد فیض الٰہی میں پانچ بجے نماز جنازہ ہے۔ وقت کم تھا، اس میں شرکت ناممکن تھی۔ لہٰذا میں دہلی گیٹ قبرستان گیا اور اس دوران مشترکہ دوستوں کو یاد کر کر کے ان کے انتقال کی خبر دیتا رہا۔ تدفین میں انتہائی کم تعداد میں لوگوں کی موجودگی دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ وہاں نہ تو کوئی معروف ادیب تھا، نہ کوئی شاعر، نہ کوئی صحافی اور نہ ہی کوئی سیاست داں۔ صحافیوں کی نمائندگی تو خاکسار نے کر دی، اس نے اپنی برادری کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ قبر میں تو تنہا ہی رہنا پڑتا ہے۔ تدفین میں بھی وہ تقریباً تنہا ہی رہے۔ وائے افسوس! بچوں کا ایک اتنا اچھا شاعر، ایک اتنا اچھا انسان اور دہلوی تہذیب کا جیتا جاگتا نمائندہ کس کسمپرسی کے عالم میں اپنی آخری آرام گاہ میں لیٹنے جا رہا تھا۔

ان کا تعلق فصیل بند شہر دہلی سے تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک بانکپن تھا۔ ایک نادیدہ حسن تھا۔ دہلوی تہذیب رچی بسی تھی۔ وہ تعلیم سے دور ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان کے اندر تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنی بھاگ دوڑ سے کچھ تعلیم حاصل کرلی۔ آج کے حساب سے بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ لیکن نامساعد حالات میں بھی انھوں نے جتنی تعلیم حاصل کی اتنی بہت سے لوگ معاون حالات میں بھی نہیں کرپاتے۔ انھوں نے ۱۹۸۷ء آگرہ یونیورسٹی سے اردو سے ایم اے اور ۱۹۸۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کیا تھا۔ اس کے علاوہ دہلی میں ایران کلچر ہاؤس سے فارسی میں ایم اے کی سند حاصل کی تھی۔ وہ اردو، فارسی، ہندی، انگریزی اور پنجابی زبانیں جانتے تھے۔ لیکن تخلیقی و تحقیقی کام اردو اور ہندی میں کرتے تھے۔

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا۔ پھر شاعری کرنے لگے اور جلد ہی بچوں کی شاعری کی طرف مائل ہوگئے۔ اسی کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ انھوں نے آسان اور عام فہم زبان میں اور سہل ممتنع میں بچوں کے لیے شاعری کی۔ نثری کتابیں لکھیں۔ بچوں کے لیے ان کی کتابوں کی تعداد کم وبیش ایک سو ہے۔ جن میں کلیات عادل، بچوں کے اقبال، گلستاں کی کہانیاں، بیربل کی کہانیاں، امیر خسرو کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، آسہیلی بوجھ پہیلی، اکڑ بکڑ، گنجہ نامہ، چڑیا گھر کے اندر، رباعیات عادل، بچوں کی نظمیں، پھول مالا اور شیخ سعدی کی حکایتیں قابل ذکر ہیں۔ ان کی کتابیں کم صفحات کی ہوتیں۔ بیس، تیس اور چالیس صفحات کی تاکہ بچے انھیں آسانی سے ہاتھ میں لے سکیں۔ انھوں نے داراشکوہ کی فارسی شاعری کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے داراشکوہ کی کتاب ''مجمع البحرین'' کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ منشی پریم چند کا ڈراما ''داراشکوہ کا دربار'' کو انھوں نے اپنے مکتبہ ملک بک ڈپو سے شائع کیا تھا۔ وہ داراشکوہ کے ادبی کارناموں کے مداح تھے۔ نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہونے والے نرمل ورما کے ناول ''لالٹین کی چھت'' کا بھی انھوں نے ترجمہ کیا تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۹۳ میں اور آخری ابھی چندروز قبل آیا تھا۔ ہندی میں بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ وہ بچوں کی اپنی شاعری کو ہندی میں منتقل کر رہے تھے۔ ادب اطفال کے سلسلے میں ان کی خدمات کے

اعتراف میں دہلی اردو اکادمی، یوپی اردو اکیڈمی، مہاراشٹر اور مغربی بنگال کی اکیڈمیوں کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی نے بھی ایوارڈوں سے نوازا تھا۔

عادل اسیر دہلوی کی شخصیت کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ''سیلف میڈ'' تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنی محنت کے بل بوتے پر کیا۔ ادب میں کسی کو گاڈ فادر نہیں بنایا۔ کسی کے دست شفقت کا سہارا نہیں لیا۔ کبھی کسی کے محتاج نہیں رہے۔ کسی ادبی گروہ میں شامل نہیں رہے۔ وہ خود ہی کتابیں چھاپتے اور خود ہی ان کو بیچتے بھی تھے۔ انھوں نے ترکمان گیٹ دہلی میں ملک بک ڈپو کے نام سے اپنا مکتبہ قائم کیا تھا۔ وہ ملک بھر میں لگنے والے کتاب میلوں میں اپنی کتابیں خود لے جاتے اور اسٹال لگاتے اور خود ہی کھڑے ہو کر فروخت بھی کرتے۔ ان کے انتقال سے دہلی میں ادب اطفال کے میدان میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا جلد پر ہونا ممکن نہیں ہے۔ وہ ادب اطفال کے تئیں اہل اردو کی بے توجہی سے دل برداشتہ تھے۔

یہ تو یاد نہیں کہ عادل اسیر دہلوی سے کب ملاقات ہوئی تھی لیکن اتنا تو یقین ہے کہ ان سے میری ملاقات کا عرصہ کم و بیش دو دہائیوں پر محیط ہوگا۔ اب جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں۔ ان کے بہت سے جملے ذہن میں کوندرہے ہیں۔ ان سے آخری ملاقات ایک ڈیڑھ ماہ قبل غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں کسی پروگرام میں ہوئی تھی۔ پروگرام میں کچھ تاخیر تھی۔ لہٰذا ان کی محبت آمیز فرمائش پر میں ان کے ساتھ ہوٹل ذکی میں چائے پینے چلا گیا۔ وہ اس موقع پر اس قدر بڑھ چڑھ کر آرڈر دے رہے تھے اور خود چائے اور بسکٹ لا رہے تھے کہ جیسے وہ اس ہوٹل کے مالک اور میزبان ہوں اور میں مہمان۔ چائے بھی مجھ سے پہلے ختم کی اور دوڑ کر بل ادا کر دیا۔

اس موقع پر ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ سماجی و ادبی مسائل پر بھی، اردو زبان کے ساتھ مختلف سطحوں پر ہونے والی ناانصافی پر بھی اور اردو صحافت کے گرتے معیار پر بھی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا:

''اردو ادیبوں کو ادب اطفال سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔ سکہ بند نقاد بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے والوں کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں''۔

اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ بتاتے ہوئے کہا:

''میں اکثر و بیشتر کتاب میلوں میں شرکت کرتا ہوں اور اپنی کتابوں کا اسٹال بھی لگاتا ہوں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے ادیب اور نقاد ادھر سے گزرتے ہیں تو بڑی حقارت سے یہ کہتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہیں اور دوسرے اسٹال کی طرف مڑ جاتے ہیں کہ ہنہ یہ تو بچوں کا شاعر ہے''۔

انھوں نے بڑے دلگیر انداز میں سوال کیا:

''سہیل صاحب ذرا آپ بتائیے کہ کیا بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنا گری ہوئی بات ہے۔ بچوں کے لیے شاعری کرنا اتنا غلط کام ہے کہ ہم اس سے نفرت کا اظہار کریں۔ یا بچوں کا ادب لکھنا اتنی گھٹیا بات ہے کہ ہم اسے لائق اعتنا ہی نہ سمجھیں''۔

''عادل صاحب! کیا کیا جائے۔ یہ تو بہت غلط بات ہے کہ لوگ ادب اطفال کے تئیں اس رویے کا مظاہرہ کریں۔ جبکہ ادب میں سب سے زیادہ اہمیت اور توجہ ادب اطفال کو ہی دینی چاہیے۔ اگر ہمارے بچے بچپن سے ہی اچھا ادب نہیں پڑھیں گے تو ان کی کردار سازی کیسے ہوگی اور ان کے اندر ادبی ذوق و شوق کیسے پیدا ہوگا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے آخر اپنی بیٹیوں کی کردار سازی کے لیے ہی تو بچوں کا ادب تخلیق کیا تھا جس کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔ دوسرے ادیبوں نے بھی جو کچھ بچوں کے لیے لکھا ہے کیا آج ان کی اہمیت نہیں ہے''۔ میں نے ان کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے۔

''میں تو ان نقادوں کے رویے سے بہت دل برداشتہ ہو گیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ اپنی ساری شاعری اور نثری سرمایہ ہندی میں منتقل کر دوں اور میں نے یہ کام شروع بھی کر دیا ہے''۔ انھوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔

انھوں نے مزید کہا:

''واللہ! کیسے کیسے بچوں کے ادیب گزرے ہیں اور کیسے کیسے بچوں کے رسالے نکلتے رہے ہیں۔ غور کیجیے تو اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو ''اردو بچوں'' کو اتنا اچھا ادب پڑھنے کو کہاں سے ملتا''۔

میں نے ان کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

''جو لوگ ادب اطفال کے تئیں اس قدر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہ اگر گوجراں والا پاکستان کی عبدالمجید کھوکھر لائبریری کے ڈائرکٹر ضیاء اللہ کھوکھر کی مرتب کردہ کتاب ''بچوں کے ادب کے سو سال'' کا مطالعہ کرلیں تو ان کو اندازہ ہوجائے گا کہ ادب اطفال کے حوالے سے اردو کا ماضی کتنا روشن، درخشاں اور شاندار رہا ہے۔ آج نہ تو ادب اطفال پر سمینار ہوتے ہیں، نہ مباحثے ہوتے ہیں، نہ خود احتسابی کے سیشن رکھے جاتے ہیں اور نہ ہی بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں کی کوئی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے''۔

وہ راقم الحروف سے بہت محبت کرتے تھے، بہت انس رکھتے تھے۔ جب بھی ملتے تو بتاتے کہ ان کی ایک اور کتاب یا کئی نئی کتابیں شائع ہوگئی ہیں۔ ان کے پاس ہوتیں تو فوراً عنایت کرتے ورنہ بعد میں دینے کا وعدہ کرتے۔ اس وعدے کا وہ پاس ولحاظ بھی رکھتے اور چند روز کے بعد بذریعہ ڈاک ان کی نئی کتابیں موصول ہوجاتیں۔ بعض اوقات دوسروں کے ہاتھوں سے بھی کتابیں بھجوادیتے۔ انھوں نے اس ناچیز کو اپنی کچھ نہیں تو پندرہ بیس کتابیں تو دی ہی ہوں گی۔ کلیات عادل بھی مرحمت فرمائی تھی۔ ایک بار وہ خاص طور پر مجھے اپنے مکتبہ ملک بک ڈپو لے گئے اور اپنی بہت سی کتابیں عنایت کیں۔

جب تک روزنامہ ''قومی آواز'' شائع ہوتا رہا وہ ہفتے دو ہفتے پر مجھ سے اور مولانا رحمت اللہ فاروقی سے ملنے اس کے دفتر آتے رہتے تھے۔ مولانا فاروقی سے ان کے تعلق کی بنیاد فارسی زبان تھی۔ اور شاید فاروقی صاحب ہی کے توسط سے ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ایسا بہت کم ہوا ہوگا کہ وہ قومی آواز آئے ہوں اور اپنی کوئی نئی کتاب نہ لائے ہوں۔ جب بھی کتاب دیتے تو تبصرے کی فرمائش بھی کرتے۔ فرصت ہوتی تو میں جلد تبصرہ کردیتا جو قومی آواز میں شائع ہوتا۔ لیکن کبھی انھوں نے تقاضا کرکے تبصرہ نہیں لکھوایا اور نہ ہی کبھی اس کی شکایت کی کہ انھوں نے کتاب دی تھی تبصرہ کیوں نہیں لکھا گیا۔ اگر کبھی انھوں نے استفسار بھی کیا اور یہ جواب ملا کہ فرصت نہیں ملی ان شاء اللہ جلد تبصرہ لکھ دیں گے تو فوراً خوش ہوجاتے اور بول پڑتے کہ کوئی بات نہیں جب آپ کو فرصت ملے لکھ دیجیے گا کوئی جلدی نہیں ہے۔

مجھے ان کی شاعری اچھی لگتی ہے۔ وہ بچوں کے کردار میں مثبت اوصاف کی پرورش کے

لیے اپنے قلم سے ہمیشہ کوشاں رہے۔ میں نے ان کی کم از کم دس بارہ کتابوں پر تبصراتی مضامین لکھے ہوں گے۔ حمد ہو یا نعت یا نظمیں، وہ ہر صنف کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کو بڑی خوبی کے ساتھ برتنا بھی جانتے تھے۔

وہ ادب اطفال میں پاکیزہ اور صاف ستھرے ادب کی تخلیق کے قائل تھے۔ ایک بار باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ اگر ہم اپنے بچوں کو پاکیزہ ادب پڑھنے کو نہیں دیں گے تو وہ آگے چل کر اچھے انسان کیسے بنیں گے۔ وہ بچوں کی نفسیات کے ماہر تھے۔ ان کی پسند کے موضوعات کو شاعری میں برتنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ انتہائی سادہ اور عام فہم زبان میں اور چھوٹی چھوٹی بحروں میں نظمیں لکھتے۔ ان کی نظمیں بچوں کو بڑی آسانی سے اور بہت جلد یاد ہو جاتیں۔ بچے ان کی نظمیں یاد کر کے مقابلوں میں کامیاب بھی ہوتے تھے۔ راقم الحروف کو ذاتی تجربہ ہے۔ میں نے بہت سے بچوں کو ان کی نظمیں یاد کروا کر آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں بچوں کے پروگرام میں پڑھوایا اور وہ بچے ہٹ ہوئے۔

وہ ایک اصول پسند انسان تھے۔ جس بات کو غلط سمجھتے اس کا برملا اظہار کرتے اور جو بات انھیں اچھی لگتی اس پر پسندیدگی ظاہر کرتے۔ وہ ایک کھلے ہوئے دل کے انسان تھے۔ کینہ اور بغض سے دور تھے لیکن جس شخص کو غلط سمجھتے اس سے قطع تعلق کر لیتے۔ ان کا کوئی دوسرا ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ کتابیں لکھنا، انھیں چھپوانا اور پھر خود ہی انھیں فروخت کرنا، یہی ان کا شب و روز کا کام تھا۔ ان کی متعدد کتابیں مختلف تعلیمی اداروں میں بطور کورس شامل ہیں۔ لیکن ان سے ان کو بشکل رائلٹی کوئی بہت زیادہ فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنی ایسی کتابوں کی رائلٹی کے لیے زور کیوں نہیں ڈالتے؟ ہنس کر کہنے لگے کہ سہیل صاحب اگر میں رائلٹی طلب کروں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری کتابیں ہی پڑھانا بند کر دیں۔ بس اسی لیے میں خاموش رہتا ہوں۔ یہی کیا کم ہے کہ میری کتابیں بچے پڑھتے تو ہیں۔ ان کی کتابیں دہلی کی شیلا دیکشت کی حکومت اکثر خریدتی رہی ہے۔ لیکن ان کو اس بات کا قلق تھا کہ دہلی میں اسمبلی الیکشن کے بعد نہ تو عام آدمی پارٹی کی حکومت نے ان کی کتابیں خریدیں اور نہ ہی لیفٹننٹ گورنر نجیب جنگ کی انتظامیہ نے۔ کتاب میلوں میں کتابوں کی فروخت بھی کم ہو گئی ہے۔ اس سے ان کو بڑا

بہت بکتی تھیں مگر اب وہ ذوق وشوق نہیں رہا۔
نقصان ہوتا تھا۔ پہلے ان کی کتابیں
وہ ایک مخلص انسان تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے جتنا ادبی سرمایہ چھوڑا ہے اگر ان
کے اندر مارکیٹنگ اور جوڑ توڑ کی صلاحیت ہوتی تو زبردست فائدہ اٹھاتے۔ ایوارڈوں کی بھرمار
کردیتے اور کرائے کے مکان میں نہیں رہتے۔ ان کو جو چند اکیڈمیوں نے انعام واکرام سے
نوازا تھا وہ ان کی خدمات کی ازخود پذیرائی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے جوڑ توڑ نہیں کی تھی۔

انتقال سے دو تین ماہ قبل سے وہ مالی اعتبار سے بہت پریشان تھے۔ جس کی وجہ سے
ذہنی ناآسودگی نے بھی آگھیرا تھا۔ راقم الحروف سے تو انھوں نے اس کا ذکر کبھی نہیں کیا لیکن
دوسرے دوستوں سے اپنی پریشانیاں بتاتے تھے۔ آخری دنوں میں مکان کا کرایہ ادا کرنے کے
بھی لالے پڑ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے ہندی میں اتنا کام کیا ہوتا تو کم از کم اس مالی
دشواری سے نہیں گزرتے۔ شاید اسی لیے وہ اپنا قلمی سرمایہ ہندی میں منتقل کر رہے تھے۔ انتقال سے قبل
وہ بہت مایوس سے ہوگئے تھے۔ دوستوں میں اس کا اظہار بھی کرتے۔

آج عادل اسیر دہلوی نہیں ہیں تو ادب اطفال کے تعلق سے ان کی خدمات یاد آرہی
ہیں۔ کیا انھیں اتنی جلد دنیا سے جانا چاہیے تھا یعنی محض پچپن سال کی عمر میں۔ لیکن کیا کیا جا سکتا
ہے۔ خالق کائنات نے جس کی جتنی سانسیں لکھ دی ہیں وہ ان سے ایک سانس بھی زیادہ نہیں لے
سکتا۔ لیکن ایک خیال بار بار ذہن میں آرہا ہے کہ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ان کی زندگی میں
پذیرائی ہونی چاہیے تاکہ ان کو اردو کی خدمت کے عوض مایوسی و ناامیدی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

☆☆

مولانا محمود الحسن

(نحیف جسم مضبوط عزائم)

۲۸ جون ۲۰۱۴ء کی شام کو جب دہلی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر مولانا محمود الحسن فیضی کے انتقال کی خبر موصول ہوئی تو بہت افسوس ہوا اور اسی کے ساتھ بہت سی یادیں بھی تازہ ہو گئیں۔ ۲۹ جون کو بعد نماز عصر جب جامعہ نگر کے بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ان کے چہرے کا آخری دیدار کیا تو یوں لگا جیسے وہ ابھی اپنی تمام تر شرافت نفسی کے ساتھ ہم کلام ہو جائیں گے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۴ء میں جامع مسجد دہلی کے قدیم تعلیمی ادارے مدرسہ ریاض العلوم میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ وہاں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ میں ایک سال قبل بھی ذریعۂ معاش کی تلاش میں دہلی آکر واپس جا چکا تھا اور دوسری بار پھر کوشش کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے ان کے بارے میں بتایا اور کہا کہ چونکہ وہ بھی بستی ضلع کے ہیں اور بہت معاون شخص ہیں اس لیے وہ تمھارے لیے ضرور کچھ کریں گے۔ میں صبح تقریباً دس گیارہ بجے ریاض العلوم پہنچا۔ ان کے بارے میں پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ فلاں کمرے میں کلاس لے رہے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ ساتھ میں والد صاحب (مولانا حامد الانصاری انجم) کا حوالہ بھی دیا۔ فوراً اٹھایا اور پانی سے تواضع کی۔ والد صاحب کی وجہ سے میرے تعلق سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

دبلا پتلا اور قدرے نکلتا ہوا قد۔ چہرے پر ہلکی داڑھی۔ چشمہ ظاہری شخصیت کا جزو۔

چہرے پر سنجیدگی اور وضعداری۔ چال میں میانہ روی۔ کپڑوں کی صفائی ستھرائی پر کم دھیان۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا کہ وہ کسی مسجد کے امام یا موذن ہوں گے۔ یہ بھی محسوس ہوتا کہ وہ کسی مسئلے پر غور و فکر میں غلطاں ہیں۔

پہلی ملاقات پر مجھے ان کے اخلاق و برتاؤ میں بڑی اپنائیت محسوس ہوئی۔ اس کی ایک وجہ اور تھی۔ اور وہ وجہ تھی مدرسہ ریاض العلوم۔ والد صاحب نے وہیں سے ۱۹۵۱ میں سند فراغت حاصل کی تھی۔ وہ مدرسے کے شیخ الحدیث مولانا عبد السلام بستوی کے عزیز شاگردوں میں رہے ہیں۔ ان کی زبانی ریاض العلوم کا اتنی بار ذکر سن چکا تھا کہ وہ اپنا مدرسہ لگنے لگا تھا۔ لہٰذا وہاں پہنچنے کے بعد کسی بھی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

مولانا محمود الحسن صاحب نے کہا کہ تھوڑی دیر رکو، کلاس ختم ہونے کے بعد گھر چلیں گے۔ دوپہر کے وقت وہ اپنے ساتھ اپنے گھر غفجر منزل جامعہ نگر لے گئے جو بالکل آخری سرے پر واقع تھا۔ وہیں دوپہر کا کھانا کھایا۔ رہنے سہنے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں رات گزار لیتا تھا۔ چند دنوں کے بعد ہمارے عزیز مولانا ابوذر صاحب کے توسط سے جو کہ اس وقت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی میں ملازمت کر رہے تھے، مکتبہ کے اکاؤنٹ سیکشن میں ساڑھے تین سو روپے کی نوکری مل گئی۔ میں مولانا محمود الحسن صاحب کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ ملازمت ملنے کے بعد ایک روز ان کے گھر گیا اور ان سے کہا: ''کہیں رہنے کا کوئی انتظام کر دیجیے''۔

''رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرا گھر تمھارا گھر ہے۔ یہاں رہو، کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے''۔ انھوں نے اپنائیت سے جواب دیا۔

پچاس گز کے پلاٹ پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے کی جگہ خالی تھی۔ باونڈری ہوگئی تھی۔ دوسرے کمرے پر چھت نہیں پڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش کی۔ میں نے بھی اس پیشکش کو غنیمت جانا۔ اس وقت ان کے ایک بیٹا مشتاق اور دو بیٹیاں ناظمہ اور صالحہ تھیں۔ وہ سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ میرا کل اثاثہ ایک معمولی سا بستر اور ایک چھوٹی سی اٹیچی پر مشتمل تھا۔ جسے ان کے گھر میں رکھ دیا۔ چھت پر جانے کے لیے زینہ نہیں بنا تھا۔ رات میں بستر لے کر نامکمل اور شکستہ دیوار کے سہارے چھت پر چڑھ جاتا

اور صبح کو بستر لے کر اتر آتا۔ اسے پھر ایک الماری میں رکھ دیتا۔

ان دنوں ان کے مکان کے پڑوس میں زردوزی کا ایک کارخانہ تھا۔ کارخانے کے مالک فیض آباد کے تھے۔ میں خالی وقت میں وہاں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ مالک کے بھتیجے نظام الدین سے جو وہاں کام کرتے تھے، دوستی ہوگئی۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب بھی رات میں موسم خراب ہوتا، بادوباراں کی نوبت آتی، میں بستر لے کر اتر آتا اور اسی کارخانے میں ایک کونے میں بچھا کر رات گزار لیتا۔ کارخانے کے باہر ایک ہینڈ پمپ تھا، کاریگر اپنی ضرورت کے لیے اسی کا استعمال کرتے تھے۔ نہانے دھونے کی میری ضرورت بھی وہی ہینڈ پمپ پوری کرتا تھا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا محمود الحسن نے جو کہ پہلے سے ہی ریاض العلوم کی ملازمت سے مطمئن نہیں تھے، وہاں سے استعفیٰ دے دیا۔ اس دوران انھوں نے ایک مکتبہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اپنے سالے کے نام سے قائم اس مکتبہ سے، جو کہ اس وقت انہی کے پاس اور اسی مکان میں رہ رہے تھے، جماعت اہل حدیث کی تاریخ سے متعلق چند کتابوں کی اشاعت بھی کی۔ لیکن یہ کام ان کے بس کا نہیں تھا۔ پیسے لگا کر چپ بیٹھ رہے۔ لیکن وہ چپ بیٹھنے والے لوگوں میں سے بھی نہیں تھے۔ ذریعۂ معاش کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ انھوں نے اپنے گھر میں ایک دکان کھول لی۔ دکان کیا تھی بچوں کے گھر گھروندا جیسی کوئی چیز تھی۔

فجر کی نماز کے بعد اوکھلا ہیڈ جاتے، وہاں سے چینی، چائے کی پتی، پاپے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں خرید کر کندھے پر لاد کر لاتے۔ خود ہی چائے بناتے۔ آس پاس زردوزی یا دوسرے کام کرنے والے مزدور ان کے یہاں ناشتہ کرنے لگے۔ میرے ناشتے کا بھی وہیں انتظام ہوگیا۔ چند دنوں کے بعد ان اشیا کے ساتھ ساتھ وہ پرچون کا سامان بھی لانے لگے۔ لیکن طریقۂ کار وہی تھا۔ ان کے پاس اتنی جمع پونجی نہیں تھی کہ وہ بیک وقت دو چار دنوں کے لیے یا ایک دن کے لیے ہی سامان لے آتے۔ دونوں وقت سامان لانا ان کا معمول تھا۔ یعنی بعد نماز فجر اور بعد نماز عصر۔

میں اکثر سوچتا کہ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے۔ اگر دیکھا جائے تو میں بھی ذریعہ معاش کے چکروں میں الجھا ہوا ہوں اور مولانا بھی۔ ہاں مولانا کے پاس ایک مکان تھا اور ان

کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے۔ان کی ذمہ داری بھی ان کے سر تھی۔اس کے علاوہ ان کے پاس ایک ایسی پونجی تھی جس سے میں محروم تھا اور وہ پونجی تھی ان کی زبردست قوت ارادی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی کہ ایک باصلاحیت اور تعلیم یافتہ شخص ہونے کے باوجود ان کے نزدیک یہ کام کوئی چھوٹا کام نہیں تھا۔ بڑی ہی دلجمعی کے ساتھ وہ اس کام میں لگے رہتے۔انھیں نہ تو چائے بنانے میں کوئی عار تھا اور نہ ہی دکان پر بیٹھ کر ایک کلو، آدھا کلو اور ایک پاؤ چاول دال تولنے میں ندامت محسوس ہوتی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ چائے کے کپ بھی خود ہی دھو ڈالتے۔ایک بار میں نے ان کو ٹوکا تو کہنے لگے: ''اس میں کیا ہے، یہ تو اپنا کام ہے، اپنے کام میں کیسی شرم''۔

یہ ان کے بڑے پن کی نشانی تھی یا کچھ اور کہ انھوں نے سر جھکا کر جو اس کام کا آغاز کیا تو پھر سر نہیں اٹھایا۔انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا کہیں گے۔انھوں نے یہ جاننے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی کہ ان کے بارے میں لوگ کیا کیا اشارے کرتے ہیں یا کس رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مزدور قسم کے لوگ اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی ان کو ''ملاجی'' کہنے لگے۔ ''ملاجی فلاں سامان دے دو، ملاجی چائے بنا دو''۔مگر ان کی پیشانی کبھی شکن آلود نہیں ہوئی۔ انھوں نے کبھی کسی سے یہ نہیں کہا کہ تم مجھے ملاجی کیوں کہتے ہو، میں تو فارغ التحصیل مولانا ہوں اور یہ کہ میں بڑے بڑے مدرسوں میں پڑھا چکا ہوں، تم لوگ مجھے ملاجی مت کہو بلکہ مولانا صاحب کہو۔ جس نے ملاجی کہہ کر جس چیز کی فرمائش کی سر جھکا کر پوری کر دی۔

ایک روز میں نے ان سے کہا: ''یہ لوگ آپ کو ملاجی ملاجی کہتے ہیں، آپ کو برا نہیں لگتا، ان سے آپ کچھ کہتے کیوں نہیں''۔

''ان سے کیا کہیں اور کیا بتائیں اور کس کس سے کہیں کہ ملاجی مت کہو، کہتے ہیں کہنے دیجیے''۔انھوں نے بڑی انکساری کے ساتھ جواب دیا۔

بہر حال صبح و شام اوکھلا ہیڈ جا کر سامان لانے کا سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا۔ جب ان کے پاس اتنے پیسے ہو گئے کہ وہ ایک بار پورے دن کا سامان لے آئیں تو پھر اوکھلا ہیڈ دن میں ایک بار جانے لگے۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کی محنت شاقہ، دلجمعی، ایمانداری، قوت ارادی اور مستقل مزاجی کا انعام تھا کہ ان کی دکان خوب چلنے لگی۔اس کا حجم بھی بڑھ گیا۔انھوں نے اسی

دکان سے گھر مکمل کیا۔اوپری منزل بنوائی اور بچوں کو اچھی تعلیم دلوائی۔

بہر حال کئی دنوں تک ان کے مکان کی چھت میرے لیے ایک آشیانہ بنی رہی۔ایک روز جب میں شام کو آفس سے ان کے گھر پہنچا تو کہنے لگے:

''لیجیے سہیل صاحب آپ کی رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا''۔

''اچھا وہ کیسے؟''۔میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ہمارے گھر کے سامنے والا مکان دیکھ رہے ہیں''۔

''جی ہاں دیکھ رہا ہوں''۔

''یہ جاوید صاحب کا مکان ہے۔وہ ٹیچر ہیں۔پرانی دلی میں اسکول میں پڑھاتے ہیں اور فی الحال وہیں رہ رہے ہیں۔یہ خالی ہے آپ اس میں رہ سکتے ہیں''۔

''لیکن مولانا اس کا تو کرایہ دینا پڑے گا،میرے پاس کرائے کے پیسے کہاں ہیں''۔

''نہیں نہیں کرایہ ورایہ نہیں دینا ہوگا، آپ اس میں ایسے ہی رہ سکتے ہیں۔جاوید صاحب کہہ رہے تھے کہ کوئی رہے گا تو مکان کی رکھوالی بھی ہوتی رہے گی''۔

''تو اس کی چابی آپ کے پاس ہے''۔میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میرے پاس نہیں ہے۔شام میں جاوید صاحب آئیں گے وہ دے دیں گے''۔

مغرب کی نماز کے آس پاس جاوید صاحب آ گئے۔انھوں نے مین گیٹ کھولا۔مجھے اندر لے گئے۔اندر گھستے ہی دائیں ہاتھ پر پاخانہ بنا ہوا تھا۔بائیں جانب کی جگہ خالی تھی۔بائیں جانب ہی تھوڑا آگے کچن اور ایک چھوٹا سا اسٹور روم بنا ہوا تھا۔باقی حصہ خالی اور کھلا ہوا تھا چھت نہیں پڑی تھی اور آخر میں ایک بڑا سا کمرہ تھا جو بیڈ روم تھا۔بیڈ روم دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اور سوچنے لگا کہ قسمت نے بہت جلد یاوری کر دی۔اتنے اچھے مکان میں رہنے کی جگہ مل رہی ہے۔بیڈ روم سجا سجایا تھا۔غالباً کچھ دنوں قبل ہی جاوید صاحب کی شادی ہوئی ہوگی۔روم میں آرائش کی بہت ساری اشیا تھیں۔میں گاؤں سے نیا نیا آیا تھا۔میں نے پہلی بار ایسا بیڈ روم دیکھا تھا۔جاوید صاحب نے بیٹھنے کو کہا۔میں ڈرتے ڈرتے فوم کے گدے پر بیٹھا۔کچھ دیر کے بعد جاوید صاحب نے کمرے سے نکل کر اس میں تالا لگا دیا اور اسٹور روم کا دروازہ کھول کر دکھایا اور کہا:

''اس میں آپ کو رہنا ہے۔ ادھر لیٹرین ہے، وہ ہینڈ پمپ ہے، جب باہر نکلیں تو مین گیٹ میں تالا لگا دیں''۔

ساری خوشیاں خاک آلودہ ہو گئیں۔ لیکن پھر بھی میں نے اس اسٹور روم کو غنیمت جانا۔ کم از کم شکستہ دیوار کے سہارے چھت پر چڑھنے اور وہاں کھلے میں سونے سے تو یہ بہتر ہی تھا۔ بس اس کے بعد میں نے اپنا کل اثاثہ اسی میں لا کر رکھ دیا اور اسے اپنی رہائش گاہ بنا لیا۔ میں نے اسٹور روم کے در و دیوار سے بہ زبان اقبال کہا کہ یہی ہے اے ساقی متاع فقیر، اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر۔ البتہ اب میری متاع فقر میں ایک بالٹی اور ایک مگ کا اضافہ ہو گیا۔ میں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے میرے لیے یہ انتظام کر دیا۔

اسٹور روم اتنا چھوٹا تھا کہ مجھ جیسا پستہ قد بھی کھل کر لیٹ نہیں سکتا تھا۔ اگر فیاضی کے ساتھ ہاتھ پاؤں پھیلاتے تو بشیر بدر کے اس شعر کا عملی نمونہ بن جاتے کہ: ''اے خدا تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں، پاؤں پھیلاؤں تو دیوار سے سر لگتا ہے''۔ میں کوشش کرتا رہا کہ دیوار سے سر نہ لگنے پائے۔ اس رہائش سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ لکھنے پڑھنے کا کچھ سلسلہ شروع ہو گیا۔ حالانکہ اسٹور روم میں بجلی نہیں تھی، میں موم بتی جلا کر لکھتا پڑھتا رہا۔

ان دنوں نہ تو غفار منزل میں کھانے کا کوئی ہوٹل تھا اور نہ ہی جامعہ کے علاقے میں۔ جامعہ کے اسٹور پر ایک بے حد خراب ہوٹل تھا۔ اس کے علاوہ بٹلہ ہاؤس میں فینس ہوٹل اور ذاکر نگر میں رشید ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اوکھلا ہیڈ پر دو تین ہوٹل تھے اور اوکھلا گاؤں میں ایک ہوٹل تھا۔ میں کبھی اوکھلا ہیڈ تو کبھی اوکھلا گاؤں جا کر کھانا کھاتا اور نیو ایرا اسکول نور نگر کی طرف سے پہاڑی کے راستے سے ہوتا ہوا پیدل غفار منزل آ جاتا۔ یہ راستہ ایک طرف سے کم از کم ایک میل تو ضرور پڑتا ہوگا۔

ان دنوں اس علاقے میں فلش لیٹرین کسی کسی گھر میں ہوتی تھی۔ جاوید صاحب کے گھر میں بھی کچی لیٹرین تھی۔ بھنگن کمانے آیا کرتی تھی۔ اس لیے مزدوروں کی نقالی میں میں بھی ایک لوٹا لے کر وہاں آس پاس پلاٹوں پر بنی باونڈری میں جاتا۔ کچھ نامکمل مکان ننگی دیواروں کے ساتھ بنے ہوئے تھے، یعنی ان کی چھت نہیں بنی تھی صرف دیواریں تھیں۔ وہی ہم لوگوں کی

اجتماعی جائے فراغت تھی۔ اس کے بہت دنوں کے بعد اس جگہ حاجی کالونی معرض وجود میں آئی۔

اب یہاں سے حالات و واقعات کروٹ بدلتے ہیں۔ کچھ دنوں تک میں اس مکان میں رہنے کے بعد بیگم پور مالویہ نگر چلا گیا جہاں ہمارے گاؤں کے ہی ہمارے ایک کلاس فیلو مبارک حسین اور ان کے ایک دوست سلیم صاحب ایک مکان میں کرائے پر رہتے تھے۔ سلیم صاحب پہلے بٹلہ ہاؤس میں مسجد والی گلی میں ابوذر صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ وہیں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مبارک حسین محکمۂ پوسٹ آفس میں سروس کرتے تھے اور سلیم صاحب گھڑی کی ایچ ایم ٹی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ بعد میں مبارک کو محکمہ ریلوے میں انجینئر کی ملازمت مل گئی اور وہ ممبئی چلے گئے۔ مکتبہ جامعہ کی میری ملازمت عارضی تھی، چھوٹ گئی۔ میں نے اردو بازار جامع مسجد میں کتب خانہ انجمن میں ملازمت کرلی۔ چار پانچ مہینے کام کرنے کے بعد اس ملازمت سے مایوس ہو کر ۱۹۸۵ء میں وطن واپس چلا گیا۔ وہاں سے میں ممبئی کے ہفت روزہ اخبار ''بلٹز'' اور دہلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار ''اخبار نو'' کے لیے بلا معاوضہ رپورٹنگ کرنے لگا۔ بس وہی میری صحافت کا آغاز تھا۔

پھر میں ''اخبار نو'' کے مدیر جناب م۔ افضل صاحب کے کہنے پر باضابطہ فروری ۱۹۸۷ کے اوائل میں دہلی آیا اور ان کے اخبار میں کام کرنے لگا۔ اس وقت میں جوگا بائی میں جناب سمیع اللہ قمر کے ساتھ ان کے کمرے میں رہنے لگا تھا۔ مولانا محمود الحسن صاحب سے یہاں وہاں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ میں ان کے گھر بھی آتا جاتا رہا۔ مولانا کا وہی انداز تھا۔ دکان پر بیٹھے ہیں اور آنے جانے والوں سے محو گفتگو بھی ہیں۔ میں بھی ان کی دکان میں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ مسئلہ مسائل بھی زیر بحث آتے۔

میں نے ملاقات کی اس پوری مدت میں ان کو ہمیشہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو پایا۔ ان کو میں نے کبھی کسی پر غصہ ہوتے یا چیختے چلاتے نہیں دیکھا۔ اگر کسی پر غصہ ہوئے بھی تو چہرے پر ناگواری کے اثرات چھا جاتے مگر زبان بند ہی رہتی۔ ان کی شرافت نفسی کی وجہ سے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بڑے بد خلق انسان ہیں۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ان کی کم گوئی کی عادت کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا۔ اس دوران وقت گزرتا رہا اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک

طویل عرصے کے بعد ایک بار اوکھلا ہیڈ پر مل گیے۔ تپاک سے ملے اور یہ خوش خبری سنائی کہ ان کے بڑے بیٹے مشتاق نے جامعہ ملیہ سے بی آرک کا کورس کرلیا ہے اور اب فلاں جگہ ٹور پر جا رہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر ملے تو بتایا کہ اسے فلاں کمپنی میں جگہ مل رہی ہے۔ ایک بار اور ملاقات ہوئی تو بتایا کہ مشتاق نے ذاکر نگر میں ڈھلان کے پاس اپنا آفس بنالیا ہے۔ ان کی بار بار کی اس قسم کی گفتگو سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں اپنے بیٹے کی کامیابی پر کتنی خوشی تھی۔ کیوں نہ ہوتی۔ انھوں نے جس حال میں اسے پڑھایا تھا وہ بس چند ہی لوگ جانتے تھے۔

اس بات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تدریسی خدمات سے سبکدوشی اور علمی کاموں سے لاتعلقی کے باوجود وہ کشن گنج، پرانی دہلی کی اہل حدیث مسجد میں ہر جمعہ کو ہمیشہ کی مانند خطبہ دینے جایا کرتے تھے۔ اس روٹین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

اسی دوران ۲۰۰۱ء میں مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی کو جمعیت کا ناظم عمومی مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دہلی سمیت پورے ملک میں جماعت کے حلقوں میں ایک نئی زندگی دوڑ گئی۔ جگہ جگہ مقامی جمعیتوں کا احیاء ہونے لگا۔ مولانا محمود الحسن بھی جمعیت کی سطح پر کافی سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے کئی ریاستوں کے دورے کیے اور لوگوں کو جمعیت کی سطح پر جوڑنے میں اہم خدمات انجام دیں۔ انھیں اسی سال کے انتخاب میں دہلی کی صوبائی جمعیت اہلحدیث کا امیر منتخب کیا گیا۔ وہ تنظیم کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو اس طرح انجام دیتے جیسے اگر انھوں نے سستی یا کاہلی دکھائی تو پوری جمعیت بیٹھ جائے گی۔ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے تحت دو مدت کار تک یعنی دس سال تک صوبائی جمعیت اہل حدیث دہلی کے امیر رہے۔ اس کے بعد وہ جمعیت اہل حدیث ہند کے تحت تادم آخر صوبائی امیر رہے۔

ان کے انتقال سے چند روز قبل جنوبی دہلی جمعیت اہل حدیث کے ناظم مولانا تجمل حسین ہمارے گھر آئے اور انھوں نے بتایا کہ مولانا محمود الحسن کو پانچ جون کو برین ہیمریج ہو گیا ہے۔ وہ ہولی فیملی اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ اسپتال والوں نے انھیں آئی سی یو میں رکھا ہے۔ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ خبر سن کر بڑا دھچکہ لگا اور اس وسوسے نے سر ابھارا کہ کہیں

یہ مولانا کا آخری وقت نہ ہو۔ کیونکہ برین ہیمرتج کے مریضوں کو بہت کم جاں بر ہوتے دیکھا گیا ہے۔

بالآخر ۲۲ روز تک موت وزیست کی کشمکش جاری رہی۔ ۲۸ جون کو وہ اس کشمکش سے نجات پا گئے۔ شام پانچ بجے جمعیت اہل حدیث ہند کی میل آئی ڈی سے ان کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ میں نے فوراً مولانا تجمل صاحب کو فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ خبر صحیح ہے اور وہ ان کے گھر ہی جا رہے ہیں۔ رات میں انھوں نے بتایا کہ ان کی میت ابھی ہولی فیملی اسپتال ہی میں رکھی ہوئی ہے جو کسی وقت رات میں گھر لائی گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں چاہنے کے باوجود ان کے گھر جا کر ان کے آخری دیدار کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ نماز جنازہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ ۲۹ جون بعد نماز عصر بٹلہ ہاؤس کے قبرستان میں جب ان کا جنازہ لایا گیا تب میں نے وہاں ان کا آخری دیدار کیا۔

☆☆

پروفیسر شعیب اعظمی

(مسجد کے زیر سایہ......)

پروفیسر شعیب اعظمی بھی چل بسے۔ یعنی اگلی شرافت کے نمونے دھیرے دھیرے اٹھتے جارہے ہیں۔ وہ دبلے پتلے اوسط قد کے تھے۔ بعد میں چہرے پر خشخشی داڑھی بھی آگئی تھی۔ شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہنتے۔ سر پر ٹوپی لگاتے۔ ان کے ایک پاؤں میں لنگ تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادھر ادھر زیادہ آنے جانے سے گریز کرتے۔

ان کے اندر شرافت و وضعداری، دوست نوازی، بے تکلفانہ انداز اور انتہائی گرمجوشی کے ساتھ ملنے کا جو سلیقہ تھا وہ کم کم لوگوں میں نظر آتا ہے۔ یوں تو ہم دونوں ایک دوسرے سے غائبانہ طور پر ایک عرصے سے متعارف تھے۔ فون پر بات چیت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن ان سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ البتہ جب میں نے ۲۰۱۰ء میں ذاکر نگر میں دوبارہ رہائش اختیار کی اور قریب کی اصلاح مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لیے جانے لگا تو مجھے ایک روز وہ مسجد میں نظر آئے۔ اگرچہ میں نے ان کو کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیوں مجھے لگا کہ ہو نہ ہو وہ شعیب صاحب ہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ میں نے بارہا اخباروں میں ان کی تصویریں دیکھی تھیں اور دوسری وجہ یہ کہ ان کے بھتیجوں جناب سرور یوسف اور جناب انور یوسف سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اصلاح مسجد کے پاس اپنی بیٹی کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ بہر حال کئی روز تک ان کو دیکھنے کے بعد ایک روز میں نے سوچا کہ آج ان سے ملاقات کر ہی لینی ہے۔ ظہر کا وقت

تھا۔ میں سنت پڑھ کر بیٹھ گیا۔ ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بھی کچھ دیر کے بعد فارغ ہو گئے۔ جب وہ مسجد سے نکل کر جانے لگے تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اصلاح مسجد کے سامنے نندو بلڈر کے دفتر والی عمارت کے برابر والی عمارت میں پہلی منزل پر ان کی رہائش گاہ تھی۔ لیکن اس میں داخلہ مسجد کی جانب سے نہیں بلکہ دوسری جانب گلی میں تھا۔ گویا ان کے فلیٹ کی پشت مسجد کے داخلی دروازے کی طرف تھی۔ جب وہ گلی میں مڑنے والے تھے تو میں نے پیچھے سے سلام کیا۔ وہ مڑے۔ وعلیکم السلام کہا اور انھوں نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا اور اس انداز میں مجھے دیکھنے لگے جیسے کوئی کسی اجنبی کو دیکھتا ہے یا کسی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نے فوراً کہا: ''آپ جناب شعیب اعظمی صاحب ہیں''۔

''جی ہاں میں وہی ہوں اور آپ؟''

''میرا نام سہیل انجم ہے''۔

بس پھر کیا تھا۔ انھوں نے مجھے لپٹا لیا اور پھر بڑے محبت آمیز انداز میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا:

''میں نے کبھی آپ کو دیکھا نہیں تھا البتہ اخباروں میں تصاویر دیکھی تھیں۔ میں نے اندازے سے آپ کو پہچانا ہے۔ کئی روز سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔ فون پر تو دو ایک بار آپ سے باتیں ہوئی ہیں لیکن ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ سوچا آج آپ سے ملاقات کر ہی لوں''۔

''ارے میرے اندر کیا ہے، میں کوئی دیکھنے کی چیز بھی نہیں ہوں''۔

وہ کچھ دیر تک مجھے تبسم آمیز انداز میں اور بغور دیکھتے رہے۔ پھر بولے:

''مگر آپ تو کہیں اور رہتے ہیں۔ یہاں کیسے آنا ہوا''۔

''جی میں پہلے کہیں اور رہتا تھا اب آپ کے پڑوس میں آ گیا ہوں''۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ فلاں عمارت میں ان کی رہائش ہے میں نے پوچھ لیا:

''آپ یہاں کہاں رہتے ہیں''۔

انھوں نے عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھا:

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

اور پھر ہنسنے لگے۔

مجھے بہت اچھا بھی لگا اور ہنسی بھی بہت آئی کہ کس طرح بہ زبان غالب اپنی عاجزی، انکساری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہیں کھڑے کھڑے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران انھوں نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ پھر دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے ہم دونوں الگ ہوئے اور ہم نے اپنی اپنی راہ لی۔

اس کے بعد تو ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بیشتر ملاقاتیں مسجد ہی میں ہوئیں۔ بعض اوقات شام کے وقت بھی وہ نظر آجاتے۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک تھیلا لے کر بازار جا رہے ہیں۔ غالباً سبزی وغیرہ لینے کے لیے۔ لیکن میں نے ایسے مواقع پر ان کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کی۔ حالانکہ اس وقت بھی وہ کوئی ایسا برجستہ شعر پڑھ دیتے جس سے لطف وانبساط حاصل ہوتا۔

ایک بار مسجد میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم دونوں بیٹھ گئے۔ دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کہا:

''میں نے یہ تو پہلے بھی سنا تھا کہ آپ کو بہت زیادہ اشعار یاد ہیں۔ اردو کے بھی اور فارسی کے بھی۔ لیکن اب میں خود دیکھ رہا ہوں کہ کس طرح آپ برجستہ اور برمحل اشعار پڑھتے ہیں''۔

''سہیل صاحب! اشعار کے یاد ہونے کی بات مت کیجیے''۔

''کیوں کیا اس میں کوئی خاص بات ہے''۔

''جی ہاں، بہت خاص بات ہے''۔

''تو پھر بتایئے نا کیا خاص بات ہے''۔ ان کے بے تکلفانہ انداز کی وجہ سے چند روز ہی کے دوران میں نے بھی تکلف کو برطرف کر دیا تھا۔

''سہیل صاحب! کسی زمانے میں مجھے اس قدر اشعار یاد تھے کہ وہ میرے لیے عذاب جان بن گئے تھے''۔

''عذاب جان بن گئے تھے، بھلا وہ کس طرح''۔

''بس کیا بتاؤں۔ عذاب جان اس طرح کہ جب میں نماز میں ہوتا تو دعاؤں کی جگہ پر اشعار نوک زبان پر آجاتے۔ میں دعائیں یاد کرنے کی جتنی کوشش کرتا اتنی ہی شدت سے اشعار یاد آنے لگتے''۔

''تو وہ اشعار متعلقہ دعاؤں ہی کے تعلق سے یاد آتے یا کوئی بھی یاد آجاتا''۔

''ارے کوئی بھی یاد آجاتا۔ بس عاجز آگیا تھا۔ کسی طرح میں نے نماز میں اشعار کی جگہ دعاؤں کو جگہ دی ہے''۔

ایک روز باتوں باتوں میں ان کے سفرنامۂ حج ''بہ طواف کعبہ رفتم'' کا ذکر چل پڑا۔ جب انھوں نے حج کیا تھا تو اس وقت تک ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ سفرنامہ میرے پاس بھیجا تھا۔ میں نے اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد اس پر تبصرہ لکھا تھا جو غالباً روزنامہ قومی آواز میں شائع ہوا تھا۔ میں نے ان کے دو تسامحات کا ذکر بذریعہ فون ان سے کر دیا تھا۔ جس پر انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کہا تھا:

''آپ لوگ جوان ہیں۔ آپ لوگوں کی یادداشت تیز ہے۔ مگر اب ہم تو بوڑھے ہو گئے ہیں اور ہماری یادداشت بھی بوڑھی ہو گئی ہے''۔

لہٰذا جب اس بار اس کتاب پر گفتگو ہوئی تو میں نے عمداً اس کا ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے بڑے ہی والہانہ انداز میں کتاب کے نام کی وجہ تسمیہ بتائی۔ انھوں نے کہا:

''اس سفرنامہ کا عنوان فارسی کے مشہور و عارف شاعر فخرالدین عراقی ہمدانی کی ایک معروف غزل سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس غزل کو پڑھتے پڑھاتے وقت ایسی کیفیت طاری ہوا کرتی کہ وقتاً فوقتاً اس کے اشعار زبان پر آجاتے۔ چنانچہ حرم کے صحن میں سجدہ ریز ہوتے وقت وہ غزل اسی ذوق و شوق کے ساتھ ورد زبان تھی اور اس غزل کے ایک شعر کے مصرعۂ اول کا نصف حصہ اس کی شانِ نزول ہے''۔

سفرناموں کے لیے ضروری ہے کہ مسافر یا سیاح جہاں جہاں سے گزرے وہاں کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ بھی بتاتا چلے۔ پروفیسر اعظمی نے اس پر پوری ایمانداری کے ساتھ عمل کیا ہے اور حج کے لیے روانہ ہونے کے وقت سے لے کر سفر حج

کے حالات وواقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مقامات مقدسہ کی تاریخ بھی بیان کی ہے اور اس کے لیے انھیں پندرہ کتابوں سے استفادہ بھی کرنا پڑا ہے۔ ایک ایک جزیات کا ذکر انھوں نے انتہائی عقیدت سے کیا ہے اور اپنے تاثرات کو مؤثر پیرایۂ بیان عطا کرنے کے لیے جگہ جگہ اشعار کا بھی استعمال کیا ہے۔ فارسی، عربی اور اردو کے بے شمار اشعار انھوں نے اس تحریر میں استعمال کیے ہیں۔ اس سفرنامہ کو پڑھنے سے آنحضورﷺ کے زمانے کے بیشتر واقعات جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں، نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے ہم بھی مدینۃ النبیؐ کے گلی کوچوں میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ لیکن بعض اشعار کی جگہ جگہ تکرار بھی ہوئی ہے جو اس خوبصورت سفرنامہ کے مطالعہ کے وقت گراں گزرتی ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ کے والد نے بھی اپنے حج کی روداد لکھی تھی اور وہ روداد یا سفرنامہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے رسالہ ''البلاغ''، ممبئی میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ جس طرح ان کے والد نے اپنے تاثرات میں دوسروں کو خاص طور پر جنھیں حج کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ہے ان لذت انگیز کیفیات سے دوچار کیا ہے جو شہر رسولؐ میں پہنچنے اور اللہ کے گھر کا طواف کرنے اور وہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے بھی دوسروں کو اس لذت کا شریک کار بنالیا ہے۔

ایک روز ان کے بھتیجے انور یوسف نے بتایا کہ شعیب صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ میں ان کے ساتھ ان کے گھر ان سے ملنے گیا۔ وہاں بھی انھوں نے خاصی علمی گفتگو کی اور یونیورسٹیوں میں تعلیم اور خاص طور پر پی ایچ ڈی کے گرتے معیار پر اظہار افسوس کیا۔

ان سے وہ میری آخری ملاقات تھی۔ پھر مسجد میں وہ نظر نہیں آئے۔ معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ البتہ کبھی کبھار اور بالخصوص نماز مغرب کے وقت میں دیکھتا کہ وہ اپنے فلیٹ میں پشت والی بالکونی پر جو کہ مسجد کے دروازے کی طرف ہے، نماز ادا کرتے ہیں۔ غالباً وہ مسجد میں آنے سے معذوری کی تلافی یوں کر رہے تھے کہ امام مسجد کے ساتھ فلیٹ میں نماز پڑھتے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ پتہ چلا کہ طبیعت زیادہ ناساز رہنے لگی ہے اور اب وہ ذاکر نگر ویسٹ میں واقع اپنے بیٹے کے مکان میں رہنے لگے ہیں۔ میں نے کئی بار خواہش

کی کہ وہاں جا کر ان سے ملاقات کروں لیکن یہ خواہش بوجوہ پوری نہیں ہو سکی۔ بالآخر ۲۸ ستمبر ۲۰۱۳ء کو اصلاح مسجد میں یہ اعلان ہوا کہ پروفیسر شعیب اعظمی کا انتقال ہو گیا ہے۔ نماز جنازہ بعد نماز عشا بٹلہ ہاؤس کی مسجد میں ہوگی اور تدفین بٹلہ ہاؤس ہی کے قبرستان میں ہوگی۔ میں نے جناب انور یوسف سے اس کی تصدیق چاہی تو انھوں نے کہا کہ ہاں ابھی تھوڑی دیر قبل ان کا انتقال ہوا ہے اور میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔

عشا کی نماز کے بعد ان کی نماز جنازہ ہوئی اور پھر ان کی تدفین عمل میں آئی۔ لیکن یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ ان کے جنازے میں کافی لوگ موجود تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر شیث محمد اسمٰعیل اعظمی کے جنازے کی مانند گنے چنے لوگ نہیں تھے۔ وہ دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے اور فارسی کی دنیا کی جانی مانی شخصیت تھے۔ ان کو ان کی علمی خدمات کے عوض صدر جمہوریہ ایوارڈ کے علاوہ دوسرے بہت سے ایوارڈ بھی ملے تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ کاش ان سے تعلق کا عرصہ کچھ زیادہ ہوتا تو شاید میں ان سے اور بھی استفادہ کر پاتا۔

☆☆☆

NAQSH BAR AAB

by

Suhail Anjum



سہیل انجم کو اگر دیکھنا ہے تو ہر جینوئن قلمکار کی طرح وہ اپنی تحریروں میں نمایاں نظر آئیں گے خصوصاً زیرِ نظر خاکوں میں۔ پڑھ کر دیکھیے یہ خاکے ایک طرح سے شفاف آئینہ ہیں جن میں ان کی بھرپور شخصیت جھلکتی نظر آئے گی۔ یہ خاکے بیک وقت آپ بیتی اور جگ بیتی ہیں۔ اس پر مستزاد ان کی بصیرت افروز تشریحات اور ذاتی نقطہ نظر۔ ان کے یہاں علم و آگہی ہے، وسیع مطالعہ ہے اور زبان و بیان پر بھرپور قدرت ہے۔ ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی ہے اور برمحل اشعار کا استعمال ان کے مضامین کو وقار بخشتا ہے۔ انسانی جذبات کی موجِ تہہِ آب ان کو معاصرین میں منفرد مقام دلاتی ہے۔ قارئین ان کے خاکوں کو ضرور پڑھیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس کا مطالعہ نقش بر آب نہیں بلکہ نقش بر سنگ ثابت ہوگا۔

منظور عثمانی، دہلی

سہیل انجم نے اپنے والد محترم ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم پر جو خاکہ لکھا ہے وہ ایک دل گداز تحریر ہے۔ راقم کی نظر سے مختلف لکھاریوں کے اپنے والدین پر لکھے کئی خاکے گزرے ہیں۔ مگر زیرِ تذکرہ خاکہ کچھ الگ ہی ڈھنگ سے لکھا گیا ہے۔ ایک بیٹے نے اپنے خوددار باپ کی زندگی کی جیسی عکاسی کی ہے، اسے پڑھ کر دل سے مولانا انجم کے لیے بے اختیار دعائے مغفرت نکلتی ہے۔ یہی ایک کامیاب تحریر کا وصف ہے۔ جو دل کو چھو جائے، جو آنکھ کو نم کر دے۔

راشد اشرف، کراچی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-764-4